وکالہ کا فقہی تصوراور اسلامی بینکوں میں عملی تطبیق (عصر حاضر کے تناظر میں تجزیاتی مطالعہ)

Wakālah and its Practical Applications in Islamic Banks

ڈاکٹر سید نعیم بادشاہ*
مفتی شفقت اللہ **

ABSTRACT

Wakālah is an agency contract in which a party mandates another party as his agent to perform a particular task. Wakālah is the need of the society, as majority of the people are so busy in their lives and pre occupation that they don't have time to settle all the issues related to banks, so they hire the services of an agent, who works on behalf of them. In the current context of Islamic finance, the customer normally appoints the financial institution as his agent to conduct a particular transaction and in return, the financial institution will receive a fee for the service.

Wakālah is used in credit card, discounting of bill of exchange, Tawarruq, and Murābaḥa etc.

This article is divided in to two sections: the first one; to study Wakālah according to Fiq'hī rules, i.e. its definition, conditions, its qualities and its specifications. And in the other part Wakālah is discussed according to application of the Bank. At the end of discussion conclusion and some suggestions are given.

KeyWords: *Wakāla ,Creditcard, Tawarruq, Murābaḥa, Discounting of Bill of Exchange, etc.*

* چیئرمین شعبہ اسلامیات، زرعی یونیورسٹی، پشاور
** پی ایچ۔ڈی سکالر، یونیورسٹی آف کراچی، کراچی

مقدمہ

عملی زندگی میں "وکالہ" کا شمار اہم موضوعات میں ہوتا ہے۔ شخصی اور اجتماعی امور سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ فقہاء کرام رحمۃ اللہ علیہم نے وکالہ کے موضوع پر تفصیلی کلام کیا ہے جس میں وکالہ کی تعریف سے لے کر اس کی شرائط و صفات اور اس کے تقاضے تک شامل ہیں۔ زمانہ قدیم میں وکالت کا تعلق زیادہ تر شخصی معاملات سے متعلق تھا، بعض موقعوں پر اجتماعی معاملات میں بھی ضرورت پڑتی تھی لیکن معاشیات میں چونکہ آج کی طرح کی جدت نہ تھی لہٰذا بینکاری میں اس کا استعمال بھی نہ تھا لیکن جب سے کنونشنل بینکوں کے متبادل غیر سودی بینک یا اسلامی بینک وجود میں آئے ہیں، وکالہ کا استعمال بھی اسلامی بینکوں کے اندر وسیع پیمانے پر شروع ہوا ہے۔ چونکہ اسلامی بینکوں میں وکالہ کی بعض صورتیں انتہائی حساس تھیں یعنی معمولی سی بے اصولی یا غفلت کی وجہ سے معاملے کو جائز سے ناجائز کے حدود میں شامل ہونے کا قوی اندیشہ تھا لہٰذا موضوع کی اس حساسیت کے پیش نظر یہ داعیہ پیدا ہوا کہ اسلامی بینکوں میں موجود وکالہ کی تطبیقی اور عملی صورتوں کا جائزہ لیا جائے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ وکالہ کونسی صورتوں میں درست ہے اور کونسی صورتوں میں حرام یا اس کی حدود میں داخل ہے۔

وکالہ کی تعریف

وکالت واؤ کے زبر اور زیر دونوں کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے۔ لغت میں اس سے مراد حفاظت ہوتی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿حسبنا الله ونعم الوكيل﴾

وکیل کا مطلب حافظ نگہبان ہے۔[۱]

شرعاً حنفیہ کے ہاں وکالت کی تعریف یہ ہے کہ:

"وهو إقامة الغير مقام نفس"، ترفها أو عجزا،في تصرف جائز معلوم"[۲]

ایک انسان کا اپنی جگہ پر کسی دوسرے کو جائز اور معلوم تصرف میں قائم مقام بنانا یا تصرف سپرد کرنا اور وکیل کی حفاظت میں دینا۔

"ركن التوكيل.فهو الإيجاب والقبول فالإيجاب من الموكل أن يقول: "وكلتك بكذا، افعل كذا، أذنت لك أن تفعل كذا،ونحوه". والقبول من الوكيل أن يقول:قبلت وما يجري مجراه".[۳]

---

(۱) سورۃ آل عمران:۱۷۳

(۲) ابن عابدین، محمد امین بن عمر بن عبد العزیز، رد المحتار علی الدر المختار، دار الفکر، بیروت، طبع دوم: ۱۹۹۲ء، ۵/ ۵۱۰

(۳) کاسانی علاء الدین، ابو بکر بن مسعود بن احمد الحنفی، البدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، دار الکتب العلمیہ، طبع دوم:۱۹۸۶م، ۶/ ۲۰۶

وکالت کا رکن: حنفیہ کے ہاں وکالت کا رکن ایجاب وقبول ہیں۔ایجاب مؤکل کی جانب سے ہو گا اوراسے اصیل کہتے ہیں وہ کہے:

"وکلتک بکذا یاافعل کذا وغیرہ، اوروکیل کی جانب سے قبول لفظ "قبلت" یااس کے قائم مقام الفاظ کے ذریعے ہو، پھر قبول ہر اس فعل سے مکمل ہو گا جو قبول پر دلالت کرتا ہو۔

وکالت کے لیے وقت مقرر کرنا

علماء کا وکالت کے لیے وقت مقرر کرنے پر اتفاق ہے کہ ایک ماہ یا ایک سال وغیرہ کا وقت مقرر کیا جاسکتا ہے۔(۱)

اجرت پر وکالت

وکالت اجرت کے ساتھ بھی صحیح ہے اور بغیر اجرت کے بھی،اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے کارندے صدقات وصول کرنے کے لیے بھیجے اوران کے لیے اجرت مقرر کی۔ نیز وکالت عقدِ جائز ہے اور وکیل پر اسے پورا کرنا واجب نہیں برخلاف گواہی کے کہ گواہ پر اس کی ادائیگی فرض ہے۔

اگر وکالت بغیر اجرت کے ہو تو یہ وکیل کی طرف سے نیکی ہے اوراگر وکالت اجرت پر ہے تو اس کا حکم اجارہ کی طرح ہے۔ وکیل، چیز کے سپرد کرنے کی وجہ سے اجرت کا مستحق ہو گا بشرطیکہ شے کا سپرد کرنا ممکن ہو مثلاً موکل نے بیع شراء اور حج کے لیے کسی شخص کو وکیل بنایا تو وہ مطلوبہ ذمہ داری ادا کرتے ہی اجرت کا مستحق ہو گا اگرچہ بیع میں ثمن پر قبضہ نہ بھی کیا ہو، اوروکالتِ اجرت میں مؤکل کے لیے جائز ہے کہ وکیل پر شرط عائد کردے کہ جس چیز کے لیے اسے وکیل بنایا گیا ہے، اس چیز کی ادائیگی تک وہ معاہدے کا حصہ رہے گا اور عدم ادائیگی یا معاہدے سے خروج کی صورت میں وہ اجرت کا مستحق نہ ہو گا۔(۲)

وکالت کی مشروعیت

وکالت، کتاب اللہ، سنت رسول اللہ ﷺ اوراجماع کی رو سے جائز ہے۔

اہل کہف کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَابْعَثُوا أَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُم هَذِهِ إِلَى الْمَدِينَةِ فَلْيَنْظُرْ أَيُّهَا أَزْكَى طَعَامًا فَلْيَأْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِنْهُ﴾(۳)

اب تم اپنے میں سے کسی کو اپنی یہ چاندی دے کر شہر بھیجو وہ خوب دیکھ بھال لے کہ شہر کا کونسا کھانا پاکیزہ تر ہے، پھر اسی میں سے تمہارے کھانے کے لیے لے آئے۔

---

(۱) کاسانی، البدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، ۶/ ۲۰

(۲) ابن ہمام، محمد بن عبد الواحد سیواسی، فتح القدیر وتکملتہ، قاضی زادہ، نتائج الافکار، دار الفکر، ۶/ ۱۲۳

(۳) سورۃ الکہف:۱۹

آیت مذکورہ میں وکالت بالشراء ہے جس میں ایک شخص کو وکیل بنا کر بھیجا گیا ہے کہ وہ دوسروں کے لیے کھانا لے کر آئے۔

سنت سے ثبوت

حضور ﷺ نے حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کو قربانی کے جانور خریدنے کے لیے وکیل بنایا۔(۱)

اجماع سے ثبوت

وکالت کے درست ہونے پر امت کا اجماع واتفاق ہے۔(۲)

وکالت کا حکم

وکالت میں اصل اباحت ہے اور کبھی یہ مستحب ہوتی ہے جبکہ مستحب پر مدد ہو اور کبھی مکروہ ہوتی ہے جب مکروہ پر مدد ہو اور کبھی حرام ہوتی ہے جب حرام پر مدد کی جائے اور کبھی واجب ہوتی ہے اور یہ اس صورت میں ہے کہ جب مؤکل سے ضرر دفع کرنا مقصود ہو ہو۔(۳)

شرائط وکالت

وکالت کے صحیح ہونے کے لیے کچھ شرائط ہیں، بعض شرائط مؤکل سے متعلق ہیں، بعض وکیل سے اور بعض اس چیز سے جس کا وکیل بنایا جارہا ہے۔

مؤکل کی شرائط

اول شرط یہ ہے کہ وکیل اس تصرف کا مالک ہو جس کے لیے اسے وکیل بنایا گیا ہے اور اس پر اس تصرف کے احکام لازم ہوں۔ اس لحاظ سے مجنون، بے ہوش اور ناسمجھ بچے کو وکیل بنانا درست نہیں اس لیے کہ ان میں عقل نہیں جو اہلیت کی شرط ہے نیز ان پر تصرفات کے احکام بھی لازم نہیں ہوتے جیسے سمجھدار بچے کو ایسی چیزوں کا وکیل بنانا درست نہیں جو ضرر محض ہیں اور جن کے کرنے کا وہ مالک نہیں جیسے طلاق، ہبہ، صدقہ وغیرہ، البتہ خالص نفع والے تصرفات جیسے تبرعات کا قبول کرنا وغیرہ، تو ان میں سمجھدار بچے کو وکیل بنانا جائز ہے اور رہ گئے وہ تصرفات جو نفع ونقصان کے درمیان دائر ہیں جیسے بیع واجارہ وغیرہ، اب اگر سمجھدار بچہ ماذون فی التجارۃ ہے تو اسے وکیل بنانا صحیح ہے اس لیے کہ وہ ان تصرفات کا مالک ہے اور اگر اسے تجارت کی اجازت نہیں تو پھر اس میں وکیل تو بن جائے گا لیکن اس کی وکالت ولی کی اجازت پر موقوف ہوگی۔(۴)

---

(۱) سنن ابی داؤد، مکتبہ رحمانیہ، اقراء سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور، ۱/۴۶۸

(۲) مفتی خالد سیف اللہ رحمانی، قاموس الفقہ، زم زم پبلشرز، اردو بازار، کراچی، ۲۰۰۷ء، ص:۳۱۰

(۳) زحیلی، وہبہ بن مصطفی، الفقہ الاسلامی وادلتہ، دار الفکر، دمشق، ۱۴۳۰ھ، ۴/۹۹۷

(۴) کاسانی، البدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، ۶/۲۰

وکیل کی شرائط

۱. وکیل عاقل ہو یعنی اسے عقد کی فہم ہو، بیع وشراء کے نفع ونقصان کو جانتا ہو اور غبن کو جانتا ہو کہ یسیر ہے یا فاحش، مجنون اور ناسمجھ بچے کی وکالت درست نہیں البتہ سمجھدار بچے کی وکالت درست ہے چاہے تجارت کی اسے اجازت ہو یا نہ ہو۔

۲. حنفیہ کے ہاں یہ شرط بھی ہے کہ وکیل عقد کا قصد کرنے والا ہو، مذاق نہ کر رہا ہو اور وکالت کو جانتا بھی ہو۔ وکیل کو وکالت کا علم بالمشافہہ یا اس کی طرف خط لکھ کر یا اس کی طرف قاصد بھیج کر یا دو آدمیوں کی خبر، جس کی وکیل تصدیق کر دے، کے ذریعے بھی ہو سکتا ہے۔

۳. وکیل نسب یا اشارہ کے ذریعے متعین ہونا چاہیے۔ اگر دو آدمیوں میں سے ایک کو غیر متعین وکیل بنایا تو جہالت کی وجہ سے وکالت درست نہیں نیز یہ بھی ضروری ہے کہ وکیل اپنے مؤکل کو جانتا بھی ہو۔

۴. شرعاً وہ معاملہ قابلِ نیابت ہو اور وہ ہر وہ چیز جس میں نیابت درست ہو اس میں وکالت درست ہے۔ عبادات بدنیہ محضہ میں وکالت درست نہیں جیسے صلوٰۃ وصوم۔ اس لیے کہ ان کا مقصد تو نفس کی مشقت اور امتحان وآزمائش ہے اور یہ مقصد وکالت سے حاصل نہیں ہوتا۔

۵. قسم کے لیے وکیل بنانا بھی درست نہیں اس لیے کہ اس کا مقصد حلف اٹھانے والے کی سچائی کا اظہار اور اللہ تعالیٰ کی عظمت، جلال اور عبودیت پر اعتماد ہے اور یہ شرعی امر ہے وطی کے لیے وکیل بنانا بھی درست نہیں اس لیے کہ اس کا مقصد پاکدامنی، نجابت وشرافتِ اولاد ہے۔[۱]

حقوق اللہ میں وکالت

حقوق اللہ میں وکالت کی دو صورتیں ہیں:

ایک وہ حقوق ہیں کہ جن میں دعوی شرط ہے جیسے حد قذف، حد سرقہ، ایسے حقوق کو ثابت کرنے کے لیے وکیل بنانا کہ وہ مؤکل کی طرف سے عدالت میں دعوی دائر کرے، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جائز ہے، خواہ مؤکل موجود ہو یا غائب، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جائز نہیں۔ جن حقوق میں دعوی شرط نہیں جیسے حد زنا، شراب نوشی کی حد، ان کے ثابت کرنے کے لیے توکیل جائز نہیں۔[۲]

---

(۱) کاسانی، البدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، ۶/ ۲۰

(۲) ابوزکریا یحی بن شرف النووی، المجموع شرح مہذب، دارالفکر بیروت، ۲۰۱۲ء، ۱۴/ ۹۳

حقوق العباد میں وکیل بنانا

حقوق العباد کی دو قسمیں ہیں:

حقوق العباد بھی دو طرح کے ہیں؛ ایک وہ جو شبہ کی وجہ سے ساقط ہو جاتے ہیں جیسے قصاص، تو ایسے حقوق کے ثابت کرنے کے لیے وکیل بنانا جائز ہے لیکن قصاص کے لیے توکیل اسی وقت جائز ہو گی جب کہ مؤکل یعنی مقتول کا ولی خود موجود ہو اگر مقتول کا ولی خود غائب ہو تو قصاص حاصل کرنے کے لیے وکالت معتبر نہیں ہو گی۔ بعض حقوق العباد وہ ہیں جو شبہ کے باوجود ثابت ہو جاتے ہیں یعنی مالی حقوق جیسے دین وغیرہ، انہیں ثابت کرنے کے لیے اور ان حقوق کو حاصل کرنے کے لیے، دونوں مرحلوں میں توکیل درست ہے۔ (۱)

مقدمہ میں وکالت

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مقدمہ کی پیروی میں وکیل بنانا جائز ہے لیکن خود عدالت میں مؤکل کی حاضری بھی ضروری ہے۔ البتہ دو صورتوں میں مؤکل حاضری سے مستثنیٰ ہوتا ہے؛ ایک یہ کہ خود دوسرا فریق اس کی عدم حاضری پر رضامند ہو یا مؤکل بیماری یا طویل مسافت کے سفر کی وجہ سے حاضری سے معذور ہو یا پردہ نشین خاتون ہو صاحبین رحمۃ اللہ علیہما اور دوسرے فقہاء کے نزدیک نہ فریق مخالف کی رضامندی ضروری ہے اور نہ مؤکل کی حاضری۔ (۲)

گواہی میں وکیل

یہ بات ظاہر ہے کہ شہادت اور گواہی کا وکیل نہیں بنایا جاسکتا، اس لیے کہ شہادت کسی واقعہ کی آنکھوں موقف ہی ہے دیکھی گواہی کا نام ہے اور اسی واقعہ کو مؤکل نے دیکھا ہے نہ کہ وکیل نے لیکن اقرار کا وکیل بنایا جاسکتا ہے، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ، البتہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کا اس سے اختلاف ہے۔ (۳)

اگر کسی شخص کو مطلقاً مقدمہ کا وکیل بنایا جائے تو وہ اپنے مؤکل کی طرف سے اقرار بھی کر سکتا ہے البتہ مؤکل اگر نے وکیل بناتے ہوئے یہ شرط لگادی کہ وہ اس کی طرف سے اقرار کرنے کا مجاز نہیں ہو گا تو اسے استثناء کا حق حاصل ہے۔ (۴)

---

(۱) ڈاکٹر وہبہ زحیلی، الفقہ الاسلامی وادلتہ، دارالاشاعت کراچی، ۲۰۱۵، ۵/ ۸۴

(۲) الشیخ نظام و جماعۃ من علماء الہند، الفتاوی العالمگیریۃ المعروفۃ بالھندیۃ، مکتبۃ ماجدیۃ، کوئٹہ، پاکستان، ۱۹۸۰ء، ۳/ ۶۱۵

(۳) کاسانی، البدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، ۶/ ۲۲

(۴) ڈاکٹر وہبہ زحیلی، الفقہ الاسلامی وادلتہ، ۵/ ۸۶

بیع وشراء کا وکیل بنانا

بیع و شراء کے لیے بغیر کسی اختلاف کے وکالت جائز ہے اس لیے کہ ان دونوں کا مؤکل خود مالک ہے لہذا دوسرے کو حوالے کرنے کا بھی مالک ہے، البتہ توکیل بالشراء کے لیے یہ شرط ہے کہ یہ جہالت کثیرہ سے خالی ہو۔ حنفیہ کے ہاں وکالت بالشراء کی دو قسمیں ہیں[۱]:

وکالت عامہ

اگر کسی چیز کے خریدنے کا وکیل بنایا جائے تو وکالت کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں: وکالت عامہ اور وکالت خاصہ۔ وکالت عامہ یہ ہے کہ وکیل کو اختیار دیا جائے کہ وہ کوئی چیز یا کوئی متعین چیز خرید، جیسے کہا جائے، "تم میرے لیے جو مناسب سمجھو خرید لو" یا یوں کہے "میرے لیے جو کپڑا خرید کرنا چاہو خرید لو" یہ وکالت عامہ ہے۔ اس میں کتنا ہی ابہام واجمال ہو، توکیل درست ہو گی۔

وکالت خاصہ

وکالت خاصہ یہ ہے کہ کسی مخصوص چیز کے خریدنے کا حکم دیا جائے اور یہ نہ کہا جائے کہ تمہاری جو مرضی ہو اس کے مطابق کر لو۔ ایسی وکالت میں اگر زیادہ ابہام (جہالت کثیرہ) ہو تو وکیل بنانا صحیح نہ ہو گا اس لیے کہ اس سے آئندہ نزاع ہونے کا اندیشہ ہے اور اگر معمولی درجہ کا ابہام (جہالۃ قلیلہ) ہے تو وکالت درست ہو گی۔

علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ نے معمولی اور غیر معمولی ابہام کے سلسلہ میں یہ اصول بتایا ہے کہ جس چیز کے خریدنے کا وکیل بنایا ہے، اگر وہ مختلف انواع کو شامل ہے تو نوعیت بیان کرنا ضروری ہو گا۔ اگر مطلوبہ نوعیت کو واضح نہیں کیا تو توکیل درست نہیں ہو گی جیسے کپڑا، کہ کپڑے کی مختلف قسمیں ہیں؛ ریشمی کتان، سوتی وغیرہ، تو کپڑے کی نوعیت متعین کرنا ضروری ہو گا ورنہ اس کو غیر معمولی ابہام سمجھا جائے گا اور اگر وہ نام ایک ہی نوع کو شامل ہو جیسے گھوڑا، گدھا، گائے، بکری تو دو چیزوں میں سے ایک کا بیان کرنا ضروری ہو گا؛ یا تو اس کی صفت کو بیان کرے جیسے کہے کہ عربی گھوڑا خریدو، یا قیمت واضح کر دے، مثلاً ایک ہزار روپے تک کا بکرا خریدو۔ اس وضاحت کے بعد جو ابہام پایا جائے گا وہ معمولی درجہ کا ہے، اور وکالت کے صحیح ہونے میں مانع نہیں، اگر صفت یا قیمت بیان نہیں کی تو یہ غیر معمولی ابہام (جہالت کثیرہ) ہے اور ایسے ابہام کے ساتھ یہ وکالت درست نہیں ہو گی۔[۲]

---

(۱) ابن عابدین، محمد امین بن عمر بن عبد العزیز، رد المحتار علی الدر المختار، دار الفکر، بیروت، طبع دوم، ۴/ ۴۱۶

(۲) کاسانی، البدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، ۶/ ۲۳

وکالت کے احکام؛ وکیل بالخصومت (محامی)

وکالت کا بنیادی حکم یہ ہے کہ وکیل کو مؤکل کے متعین کیے ہوئے دائرہ میں رہتے ہوئے تصرف کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔[۱]

حنفیہ کے نزدیک جس شخص کو مقدمہ کی پیروی کا وکیل بنایا جائے، اسے قصاص اور حدود کے علاوہ دوسرے مقدمات میں اقرار کا بھی اختیار ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مجلس قضاء ہی میں اس کا اقرار معتبر ہو گا۔

جس شخص کو کسی مالی مقدمہ میں وکیل بنایا گیا ہو وہ احناف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس مال پر قبضہ حاصل کرنے کا بھی مجاز ہو گا، امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد کا یہی موقف ہے، امام زفر رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک وکیل قبضہ کرنے کا مجاز نہیں، متاخرین نے اپنے زمانہ میں بڑھتی ہوئی بد دیانتی اور خیانت کی وجہ سے امام زفر رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو قبول کیا ہے، یہی حکم اس شخص کے بارے میں بھی ہے جس کو صرف دین کے تقاضا کرنے کا وکیل بنایا گیا ہو۔

جس شخص کو دین کے وصول کرنے کا وکیل بنایا گیا ہو، اگر مقروض دین کا انکار کرے تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وکیل اس مقدمہ میں فریق بن سکتا ہے۔ وہ فریق مخالف کے مقابلہ میں دین کو ثابت کرنے کا مجاز ہے اور اگر مدعی علیہ گواہان پیش کر دے کہ صاحب دین یعنی مؤکل قرض وصول کر چکا ہے یا اس نے قرض معاف کر دیا ہے، تو یہ ثبوت قابل سماعت اور قابل قبول ہو گا۔ صاحبین رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک دین پر قبضہ کا وکیل ثبوتِ دین کے مقدمہ میں فریق نہیں بن سکتا۔[۲]

وکیل بالبیع

وکیل بیع یا تو مطلق تصرف کا مجاز ہو گا یا اس کے تصرفات مقید ہوں گے۔ اگر اس کا تصرف مقید ہو تو اس میں قید کی بالاتفاق رعایت رکھی جائے گی، جب وہ اس کی قید کی مخالفت کرے تو اس کا تصرف مؤکل پر نافذ نہیں ہو گا، ہاں اس کی اجازت پر موقوف ہو گا۔ وکیل اگر اپنے مؤکل کی مخالفت کرے اور اس میں مؤکل کا فائدہ ہو تو اس کی بھی اجازت ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ مؤکل کہے میرا یہ باغ ایک ہزار ڈالر کا فروخت کرو تو اس نے ایک ہزار سے کم پر فروخت کر دیا تو یہ نافذ نہیں ہو گا اس لیے کہ اس میں مؤکل کا نقصان ہے اور اگر ایک ہزار سے زیادہ کا فروخت کر دیا تو یہ بیع نافذ ہو گی کیونکہ یہ مخالفت فائدہ مند ہے۔ اگر نقد فروخت کرنے پر کسی شخص کو وکیل بنایا گیا اور اس نے ادھار فروخت کیا تو یہ معاملہ نافذ نہ ہو گا، بلکہ مؤکل کی اجازت پر موقوف ہو گا اور اگر ادھار فروخت کرنے کا وکیل بنایا گیا اور اس نے نقد فروخت کیا تو یہ معاملہ نافذ ہو جائے گا۔[۳]

---

(۱) کاسانی، البدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، ۶/ ۲۳

(۲) ایضاً، ۶/ ۲۴

(۳) ایضاً، ۶/ ۲۸

وکالت ختم ہونے کے طریقے

وکالت عقد لازم نہیں بلکہ عقد جائز کی ہے، یعنی مؤکل ہو یا وکیل وکالت کو ختم کر سکتے ہیں۔ اسی پس منظر میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ کن صورتوں میں وکالت ختم ہوتی ہے ؟علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ نے تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے، وہ صورتیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ مؤکل کا وکیل کو معزول کرنا

مؤکل وکیل کو معزول کر دے، وکیل کو اپنی معزولی کا علم ہو جائے اور اسکی وکالت سے کسی تیسرے شخص کا حق متعلق نہ ہو۔ جب تک وکیل کو اپنے معزول ہونے کی اطلاع نہ ہو، اس کا تصرف مؤکل ہی کی طرف منسوب ہو گا، اگر وکالت سے کسی تیسرے شخص کا حق متعلق ہو تو اس شخص کی رضامندی کے بغیر مؤکل اسے معزول نہیں کر سکتا جیسے ایک شخص نے قرض لیا اور قرض دہندہ کے بجائے کسی تیسرے کے پاس کوئی سامان بطور رہن رکھا اور اس کو وکیل بنایا کہ مدت مقررہ پر قرض ادا نہ کرنے کی صورت میں وہ سامان رہن کو فروخت کر کے قرض دہندہ کا قرض ادا کر دے، اب اگر مقروض اس کو وکالت سے معزول کر دے تو ظاہر ہے کہ قرض دہندہ کا قرض متاثر ہو گا، اس لیے یہ صورت درست نہیں۔

۲۔ مؤکل کی موت ہو جائے۔

۳۔ مؤکل پاگل ہو جائے، پاگل ہونے سے مراد مستقل پاگل ہو جانا ہے اگر عارضی دورہ ہو جو ایک ماہ سے کم مدت پر محیط ہو تو اس سے وکالت ختم نہیں ہو گی، ایسے مستقل پاگل کو اصطلاح میں "جنون مطبق" کہتے ہیں۔

۴۔ مؤکل خود تصرف سے عاجز ہو جائے، جیسے عدالت کسی شخص کو دیوالیہ قرار دے کر اس مال میں تصرف کرنے سے روک دے۔

۵۔ وکیل کی موت واقع ہو جائے۔

۶۔ وکیل جنون مطبق میں مبتلا ہو جائے۔

۷۔ مؤکل کا مؤکل فیہ میں تصرف کرنا

جس چیز میں وکیل بنایا تھا اس میں مؤکل خود تصرف کر دے۔

۸۔ جس چیز کو بیچنے یا ہبہ کرنے کا وکیل بنایا تھا وہ چیز ہی ضائع ہو جائے۔

۹۔ خدانخواستہ مؤکل دارالاسلام سے دارالحرب میں چلا جائے۔[1]

۱۰۔ وکیل کا اپنے آپ کو معزول کرنا

---

(۱) کاسانی، البدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، ۶/ ۲۳۸-۲۳۹

وکیل اپنے آپ کو وکالت سے علیحدہ کر لے۔ جب وکیل یہ کہے کہ میں نے اپنے آپ کو معزول کر دیا یا میں وکالت کو رد کرتا ہوں یا میں اس سے نکلتا ہوں تو معزول ہو جائے گا اس میں شرط یہ ہے کہ مؤکل کو معلوم ہو تا کہ اسے نقصان نہ ہو۔[۱]

ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے چند صورتیں اور لکھی ہیں اور وہ یہ ہیں:

۱۔ وکیل کو جو کام سپرد کیا گیا تھا وہ اسے پورا کر دے۔

۲۔ مؤکل وکیل بنانے سے یا وکیل وکالت کے قبول کرنے سے انکار کرتا ہو۔

۳۔ وکیل اپنے آپ کو وکالت کی ذمہ داری سے سبکدوش کر لے، تاہم اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ مؤکل کو اس سے آگاہ کر دے۔

اسلامی بینکوں میں وکالہ کی صورتیں

درج بالا مضامین میں عقد وکالۃ کا فقہی جائزہ لیا گیا ہے اور اسلامی بینکوں کے عقد کی اساس بھی فقہ اسلامی پر ہے۔ عقد وکالۃ اسلامی بینکوں میں مروج ہے۔ ذیل میں انہی مروجہ صورتوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے:

کریڈٹ کارڈ میں وکالت

کریڈٹ کارڈ قرض لینے دینے کے معاملے کا نام ہے۔ کارڈ کے رکھنے والے کو بینک قرض دیتا ہے اور کارڈ ہولڈر قرض لیتا ہے، یا قرضہ پر خرید و فروخت اس کارڈ کے ذریعہ سے کرتا ہے۔ بعد میں بینک، تاجر کو کارڈ ہولڈر کے بل کی ادائیگی کر دیتا ہے، اس اعتبار سے یہاں قرض، وکالت اور کفالت تینوں معاملوں کو یہ کارڈ شامل ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

قرض

قرض کا معاملہ یوں ہے کہ کارڈ ہولڈر بینک سے اس کارڈ کی جانب سے فراہم کردہ سہولت کے مطابق قرض لیتا ہے اور بعد میں اس کو ادا کرتا ہے اور شرعی اصطلاح میں قرض کی تعریف عند الاحناف یہ ہے:

"دفع الما ارفاقاً لمن ينتفع به ويرد بدله"[۲]

قرض بدل کی ادائیگی کی شرط پر نفع اٹھانے کے لیے مال دینے کا نام ہے۔

کریڈٹ کارڈ کے توسط سے بینک کی جانب سے جو قرض دیا جاتا ہے، کارڈ ہولڈر حسب ضابطہ مقررہ رقم ایک سال تک یا ایک سال کے اندر اندر اس سے خریداری کرتا ہے یا رقم حاصل کر لیتا ہے پھر وہ ایک سال کے اندر ہی

---

(۱) عثمان بن علی، فخر الدین زیلعی، تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق، المطبعۃ الامیریہ، بولاق، ۱۳۱۴ھ، ۴/۲۸۶

(۲) منصور بن یونس بن ادریس البہوتی، کشاف القناع عن متن الاقناع، عالم الکتب، بیروت، ۱۹۸۳ء، ۳/۲۹۸

مقررہ مدت میں اس رقم کو بینک میں جمع کرا دیتا ہے۔ مذکورہ صورت میں سودی لین دین سے بچتے ہوئے قرض کا معاملہ کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے اس لیے کہ قرض کے لین دین میں اگر سودی معاملہ کا دخل نہیں ہے تو ایسی صورت میں قرض جائز ہے۔

بینک کارڈ ہولڈر کا وکیل اور کفیل بھی

کریڈٹ کارڈ کو قرض کے بعد وکالت کا معاملہ بھی شامل ہے، چنانچہ حنفیہ کے نزدیک شرعی اعتبار سے معلوم وجائز تصرف میں کسی کو اپنی ذات کا قائم مقام بنانے کو وکالت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔[۱]

کریڈٹ کارڈ میں وکالت اس طرح سے ہے کہ اگر کارڈ ہولڈر کسی تاجر کے پاس کوئی خریداری کرتا ہے اور اس تاجر کو اپنا کارڈ دکھا کر کہتا ہے کہ وہ اس کی خریدی ہوئی اشیاء کی قیمت بینک سے وصول کرلے تو یہاں بینک اس کارڈ ہولڈر کا وکیل ہوا کہ وہ اس کے تمام قیمت یا بلوں کی وصولیابی اور ان کی ادائیگی کا پابند ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے کریڈٹ کارڈ کے معاملہ میں قرض کی رقم بینک کے قبضہ میں ہوتی ہے اور وہ کارڈ ہولڈر کے وکیل کی حیثیت سے اس کے تمام بلوں کی ادائیگی کرتا ہے بالعکس وہ تاجر حضرات کا بھی وکیل بن کر کارڈ ہولڈر سے رقم وصول کرتا ہے، اس لحاظ سے بینک کارڈ ہولڈر اور تاجر دونوں کا وکیل ہوتا ہے، یہ صورت جائز ہے، اس کے جواز میں فقہاء کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔[۲]

کریڈٹ کارڈ کی فیس

کارڈ کے اجراء کے لیے بینک جو فیس کارڈ ہولڈر سے لیتا ہے وہ جائز ہے، اسی طرح اس کارڈ کی سالانہ فیس اور اس کے تجدید (Renewal) کی فیس بھی جائز ہے، اس قسم کی رقم یا فیس سروس چارج (اجرت) یا خدمات کے عوض کی حیثیت سے لی جاتی ہے۔ قرض یا قرض کی رقم سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ نیز بلوں کی ادائیگی کے سلسلہ میں بینک تاجروں سے جو کمیشن وصول کرتا ہے یہ بھی بینک کی سروس چارجز یا خدمات کا عوض ہے۔ یہ رقم یا کمیشن بھی جائز ہے کیونکہ بینک کارڈ ہولڈر اور تاجر دونوں کا وکیل ہے اور وکیل کا اجرت لینا جائز ہے۔

اس کارڈ کے ذریعہ حاصل کردہ رقم کے ساتھ مزید جو رقم ادا کرنی ہوتی ہے وہ اگر سالانہ فیس یا تجدید کی فیس ہو تو وہ جائز اور تاجر کمیشن ادا کرے تو وہ بھی جائز ہوگی، ہاں اگر تاخیر کی صورت میں زائد رقم کی ادائیگی ہو تو ایسی رقم کا دینا یا لینا حرام ہے۔ واجب الادء رقم کی ادائیگی میں تاخیر کی وجہ سے جو رقم ادا کرنی ہوتی ہے، وہ رقم سود کو شامل ہے اس لیے کارڈ ہولڈر کے لیے لازمی ہے کہ اس طرح کی تاخیر سے گریز کرے تاکہ وہ سود کی ادائیگی سے بچ سکے۔

---

(۱) وہبہ بن مصطفی زحیلی، الفقہ الاسلامی وادلتہ، ۵/ ۴۷

(۲) قاسمی، مجاہد الاسلام، جدید فقہی مباحث، ادارۃ القران والعلوم الاسلامیہ، گلشن اقبال، کراچی، ۲۰۰۹، ۳۴/ ۱۵۹

معاملہ میں اس بات کا شامل ہونا کہ مقررہ مدت پر ادا نہ ہونے کی صورت میں اصلی رقم سے زائد ادا کرنی ہوگی، یہ باطل شرط ہے جس کا معاملہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا یعنی قرض کا معاملہ صحیح اور درست ہے اور شرط باطل ہے۔ فی الجملہ ربا سے بچتے ہوئے کریڈٹ کارڈ کی سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ (۱)

تورق میں وکالت

تورق سے مراد یہ ہے کہ انسان کوئی چیز ادھار خریدے پھر اسے فروخت کنندہ کی بجائے کسی تیسرے شخص کو کم قیمت پر نقداً فروخت کردے تاکہ اسے نقد رقم حاصل ہو جائے خواہ وہ کم ہی کیوں نہ ہو۔ فقہاء کرام نے تورق کی جس صورت کے جواز کا حکم دیا ہے وہ یہ ہے جس میں دو معاملات علیحدہ علیحدہ ہوں۔ ایک یہ کہ بائع اس سامان کو جو اس کی ملکیت وقبضہ میں ہے، متورق کو ادھار فروخت کرے اور دوسرا یہ کہ متورق اس سامان کو ایسے تیسرے شخص کے ہاتھ فروخت کرے، جس کا بائع اول سے کوئی تعلق نہ ہو لیکن بہت سے بینک اور مالیاتی ادارے اس میں ایک تیسرا معاملہ بھی ملاتے ہیں وہ توکیل کا معاملہ ہے مثلاً جب بینک سے معاملہ کرنے والوں میں سے کوئی ایک شخص سرمایہ کاری کو تورق کی بنیاد پر کرنا چاہتا ہے تو بینک اس شخص کو اپنی ملکیت میں موجود سامان نہیں بیچتا بلکہ بنک بازار سے خریدنے کا محتاج ہوتا ہے۔ اب اگر بینک اپنے ملازمین میں سے کسی ایک ملازم کے ذریعے سامان خود خریدے تو اس معاملہ کا قبول کیا جانا ممکن ہے لیکن بہت سی صورتوں میں بینک سامان خود نہیں خریدتا بلکہ تورق کرنے والے ہی کو اپنے نائب کی حیثیت سے سامان خریدنے کا وکیل بنادیتا ہے، پھر متورق وہ سامان بینک سے ادھار خرید لیتا ہے اور تیسرے شخص کو نقد فروخت کردیتا ہے اور بہت سے بینکوں میں یہ طریقہ جاری ہے کہ بنک اصل بائع کو ثمن ادا نہیں کرتا بلکہ بینک متورق ہی کو وکیل بالشراء ہونے کی حیثیت سے رقم کی ادائیگی کردیتا ہے۔ (۲)

یہاں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے یعنی کلائنٹ یا متورّق پہلے وکیل کی حیثیت سے قبضہ کرے پھر مؤکل کے ساتھ نئے ایجاب کے ذریعے دوسرا معاملہ کرے پھر یہ عقد درست ہوگا ورنہ اگر یہاں دو معاملے الگ الگ نہ ہوئے بلکہ متورق نے وکیل کی حیثیت سے چیز خریدی پھر فوراً اپنے آپ کو بیچ دی تو یہ صورت جائز نہیں ہوگی۔

چونکہ یہ توکیل تورق کی طرف منسوب ہوتی ہے، اس لیے یہ معاملہ سودی سرمایہ کاری کے مشابہ ہوجاتا ہے، کیونکہ متورق بینک سے کم رقم لیتا ہے اور مدت پوری ہونے پر بینک کو زیادہ رقم واپس لوٹاتا ہے، اگرچہ متورق کا بینک سے کم رقم لینا وکیل بالشراء ہونے کی حیثیت سے واقع ہوا تھا، قرض لینے والے کی طرح نہیں۔ لیکن یہ باریک سا فرق اس معاملہ کو سودی سرمایہ کاری کے مشابہ ہونے سے دور نہیں کرتا، اور یہ توکیل بالشراء کبھی عقد کو ممنوع اور کبھی

---

(۱) مجاہد الاسلام قاسمی، جدید فقہی مباحث، ۳۴/۱۶۴

(۲) عثمانی، محمد تقی، فقہی مقالات، میمن اسلامک پبلشرز، کراچی، ۲۰۱۲، ۵/۱۷۱

مکروہ بنادیتی ہے۔ (۱) یعنی تورق میں جو توکیل والا معاملہ ہے اس میں تمام باریکیوں کالحاظ رکھاجائے ورنہ معمولی سی غفلت اور بے پروہی اس کو سودی معاملے کی طرف لے جاتی ہے مثلاً اگر متورق یعنی کلائنٹ وکیل کی حیثیت سے سامان خریدنے کے بعد بینک کی جانب رجوع کرے، اور پھر اس کے ساتھ الگ ایجاب وقبول کے ذریعے بیع کا معاملہ کرے تو اس صورت میں عقد درست ہو گا اور اگر معاملہ کو الگ الگ نہیں رکھا تو پھر اس کی سودی معاملے کے ساتھ مشابہت ہو جائے گی جیسے سودی بینکوں میں کلائنٹ بینک سے کم رقم بطور قرض لیتا ہے پھر مدت پوری ہونے کے بعد زیادہ رقم واپس کرتا ہے اسی طرح یہاں بھی یہی نظر آئے گا کہ گویا متورق نے بینک سے کم پیسے ادھار لیے اور مدت پوری ہونے کے بعد زیادہ واپس کر دیئے۔

اجارہ میں وکالت

اسلامی بینکوں میں کسی چیز کو کرایہ پر دینے کا معاملہ دو طریقوں سے ممکن ہے۔

پہلی صورت

پہلی صورت یہ ہے کہ بنک اشیاء اور سامان خود خریدے اور پھر بطور مالک کے اس پر قبضہ بھی کرے اور پھر بینک وہ چیز مدت معلومہ اور اجرت معلومہ پر اپنے گاہک کو کرایہ پر دے دے۔ اس صورت میں مدت اجارہ کے ختم ہونے کے بعد وہ اشیاء اور سامان دوبارہ بینک کے قبضہ میں آجائے گا اور پھر فریقین کو اختیار ہو گا، چاہیں تو دوبارہ جدید عقد اجارہ کرلیں یا فریقین آپس میں اس وقت کوئی ثمن طے کر کے عقد بیع کرلیں، اور بنک کو یہ بھی اختیار ہے کہ وہ اشیاء اور سامان کو دوسرے گاہک کو کرایہ پر دے دے یا دوسرے گاہک کے ہاتھ فروخت کرے۔ مذکورہ طریقہ تو شرعاً بالکل جائز ہے اور اس کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں۔

دوسری صورت

دوسری صورت یہ ہے کہ بینک ایسی اشیاء اور سامان کرایہ پر دے جو عقد جارہ کے وقت اس کی ملکیت میں نہیں ہے بلکہ عقد اجارہ کرنے کے بعد بینک وہ سامان سپلائر سے خریدے اور پھر بینک اپنے گاہک کو اس سامان پر قبضہ کرنے اور اس کو وصول کر کے اپنے یہاں نصب کرنے کا وکیل بنادے، اور بینک ایک تاریخ مقرر کر دے گا کہ فلاں تاریخ پر عقدِ بیع مکمل ہو کر عقد اجارہ شروع ہو جائے گا۔ چنانچہ اس مقررہ تاریخ کے بعد بینک اس چیز کا کرایہ گاہک سے وصول کرتا رہے گا، یہاں تک کہ عقد اجارہ کی مدت معاہدہ کے مطابق پوری ہو جائے اور بنک اپنے تمام واجبات گاہک سے وصول کرلے تو پھر بنک وہ سامان معمولی ثمن پر اسی گاہک کے ہاتھ فروخت کر دے گا۔

اس دوسری صورت میں فقہی اعتبار سے چند امور قابلِ غور ہیں:

---

(۱) محمد تقی عثمانی، فقہی مقالات، ۵/۱۷۱

۱۔ عقدِ اجارہ کا عقد کئی عقود کا مجموعہ بن جاتا ہے جبکہ شرعی نقطہ نظر سے یہ درست نہیں۔
۲۔ یہ عقد اجارہ سے شروع ہو کر بیع پر منتج ہوتا ہے، یہ بھی درست نہیں۔

اس مشکل کا حل فقہاء نے مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے۔ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ وعدہ بیع کو اجارہ کے ساتھ مشروط نہ کیا جائے بلکہ وہ وعدہ مستقل علیحدہ کیا جائے۔ اس کی صورت یہ ہو گی کہ فریقین کے درمیان ایک وعدہ ایگریمنٹ میں ہو جائے جس میں اسی بات کا وعدہ ہو کہ فریقین پہلے عقد اجارہ کریں گے اور اس کے اختتام پر بیع کریں گے، پھر وعدہ کے مطابق وقت مقررہ پر فریقین کے درمیان اجارہ ہو جائے جس میں بیع کا کوئی ذکر نہ ہو۔ اس کے بعد جب اجارہ کی مدت ختم ہو جائے تو مستقل بیع کر لی جائے جس میں کوئی شرط وغیرہ نہ ہو، اس طرح دونوں عقد مستقل اور غیر مشروط ہو جائینگے اور اس طرح فریقین کے درمیان جو معاہدہ ہو گا وہ تین باتوں پر مشتمل ہو گا:

الف۔ بینک گاہک کو سامان خریدنے کا وکیل بنائے گا۔

ب۔ گاہک یہ وعدہ کرے گا کہ وہ سامان وصول کرنے اور اس کو اپنے قبضے میں لانے اور نصب کرنے کے بعد اس کو کرایہ پر لے لے گا۔

ج۔ بینک یہ وعدہ کرے گا کہ اجارہ کی مدت ختم ہونے کے بعد وہ سامان اس گاہک کو فروخت کر دے گا اس معاہدہ کے مکمل ہو جانے کے بعد گاہک صرف سامان خریدنے کے سلسلے میں بینک کا وکیل ہو جائے گا پھر وکالت کا عمل مکمل ہو جانے کے بعد وعدہ کے مطابق عقد اجارہ مستقل طور پر اپنے وقت پر منعقد ہو گا، اور پھر وعدہ کے مطابق اجارہ کی مدت ختم ہو جانے کے بعد فریقین کے درمیان مستقل طور پر بیع منعقد ہو جائے گی۔

اور گاہک کی طرف سے اجارہ پر لینے کا وعدہ اور بینک کی طرف سے فروخت کرنے کے وعدہ کو دیانۃً پورا کرنا فریقین کے ذمہ بالاجماع واجب ہے۔ جہاں تک قضاءً اس وعدے کے ایفاء کا تعلق ہے تو مالکیہ کے مذہب کے مطابق اگر وعدہ کرنے والے نے وعدہ کر کے موعود لہ کو کسی ایسے معاملہ میں داخل کر دیا ہے جو اس وعدہ کی وجہ سے اس پر لازم ہوا ہے تو اس صورت میں قضاءً اس وعدہ کو پورا کرنا واجب ہے اور اگر وعدہ کرنے والا وعدہ خلافی کرے اور اس وعدہ خلافی کی وجہ سے موعود کو کوئی نقصان ہو جائے تو وعدہ کرنے ولا اس مالی نقصان کا ضامن ہو گا۔ حنفیہ کے مسلک میں وعدہ اگرچہ قضاءً لازم نہیں ہوتا، لیکن متاخرین فقہاء حنفیہ نے وعدہ کو لازم بھی قرار دیا ہے۔[1]

(۱) محمد تقی عثمانی، فقہی مقالات، ۱/ ۸۲

خلاصہ

اس عقد کو شرعی طور پر جائز کرنے کے لیے اس میں مندرجہ ذیل شرائط کالحاظ ضروری ہے۔

۱. بینک اور گاہک کے درمیان جو ایگریمنٹ لکھا جائے، اس میں گاہک کو سامان خریدنے کے لیے وکیل بنانے کا معاملہ تو قطعی اور یقینی ہو لیکن اس ایگریمنٹ میں اجارہ اور بیع کا تذکرہ صرف بطور وعدہ کے ہو، قطعی اور فیصلہ کے طریقہ پر ان کا عقد نہ کیا جائے۔

۲. جب گاہک سامان خرید کر اس پر قبضہ کرلے اور اس کو اپنے ہاں نصب کرلے، اس کے بعد عقد اجارہ بالمشافہہ یا مراسلت کے ذریعے کیا جائے اور اس عقد اجارہ کے وقت بیع کا تذکرہ نہ کیا جائے۔

۳. سامان کی خریداری کے بعد اور عقد اجارہ ہونے سے پہلے وہ سامان بینک کی ضمان میں رہے گا۔

۴. اگر فریقین میں کوئی ایک وعدہء اجارہ یا وعدہء بیع کی خلاف ورزی کرے گا تو اس وعدہ خلافی کے نتیجے میں فریق ثانی کو جو مالی نقصان ہو گا فریق اول اس نقصان کی تلافی کرے گا۔[1]

بل آف ایکسچینج میں وکالت

مالی دستاویز کی ایک قسم جس کا رواج آج کل بازار میں جاری ہے، "بل آف ایکسچینج" کہا جاتا ہے۔ یہ درحقیقت ایک دستاویز ہے جو بیع مؤجل میں مشتری بائع کو لکھ کر دیتا ہے، جس میں مشتری کی طرف سے اس بات کا اعتراف ہوتا ہے کہ اس کے ذمہ مبیع کا ثمن واجب ہے اور آنے والی تاریخ میں اس کی ادائیگی اس کے ذمہ لازم ہے اور بائع جو بل آف ایکسچینج کا حامل ہے وہ بعض اوقات اس بل کی رقم کو تاریخ سے پہلے حاصل کرنا چاہتا ہے، لہذا وہ بل کو کیش کرنے کی تاریخ کا انتظار نہیں کرتا بلکہ بائع وہ بل کسی تیسرے شخص کو اس پر درج شدہ قیمت سے کم قیمت پر فروخت کر دیتا ہے، اس عمل کو "ڈسکاونٹنگ آف بل" کہا جاتا ہے۔

اکثر علماء معاصرین نے "ڈسکاونٹنگ آف بل" کا حکم "دین کی بیع اقل نقد کے عوض فروخت" کی بنیاد پر نکالا ہے، اور اس جہت سے اس کی ڈسکاونٹنگ کو حرام قرار دیا ہے۔

بل آف ایکسچینج کی کٹوتی کا متبادل

بل آف ایکسچینج کی کٹوتی کا جہاں تک تعلق ہے، اس مقصد کے حصول کے فقہاء نے مختلف طریقے بیان کیے ہیں، ان میں اسے ایک طریقہ وکالہ کی بنیاد پر بھی ہے جس کی تفصیل یوں ہے:

بینک اور "حاملِ بل" کے درمیان دو معاملات بالکل مستقل اور علیحدہ علیحدہ ہوں، پہلا معاملہ یہ ہو کہ "بل" کا حامل بینک کو اپنا وکیل بنادے کہ جب اس "بل" کو کیش کرانے کی تاریخ آجائے تو "بل" جاری کرنے والے سے

---

(۱) محمد تقی عثمانی، فقہی مقالات، ۱/۲۸۱

اتنی رقم وصول کرلے اوراس خدمت اور سروس کے عوض "حامل بل" بینک کوایک متعین رقم بھی دے۔ دوسرا معاملہ یہ ہو کہ بینک اس تاجر یاایجنٹ کو"بل"میں درج شدہ رقم سے اپنی وکالت کی رقم کم کرکے بقیہ رقم تاجر کو غیر سودی قرض کے طور پر دے دے۔ مثلاً زید "حامل بل" ہے اور بل کی رقم ایک لاکھ روپے ہے، اب زید بینک کو اپناوکیل بنادیتاہے کہ بینک بل جاری کرنے والے سے اس کی تاریخ آنے پر یہ میری طرف سے رقم وصول کرلے اوراس خدمت پر ایک ہزار روپے زید بطوراجرت کے بینک کو دے گا، پھر بینک زید کو ایک مستقل عقد کے ذریعے ننانوے ہزار روپے غیر سودی قرض کے طور پر دیتاہے، اور جب مقررہ مدت پر ایک لاکھ روپے پر بل جاری کرنے والے کی طرف سے وصول ہوں گے، اس وقت آپس میں حساب برابر ہوجائے گا، وہ اس طرح کہ بینک ننانوے ہزار روپے تو قرض کے عوض رکھ لے گا اورایک ہزار روپے رقم وصول کرنے کی اجرت کے طور پر رکھے گا، البتہ اس طریقہ کے جواز کے لیے مندرجہ ذیل تین شرائط کا پایاجاناضروری ہے۔

۱. بینک اور گاہک کے درمیان جو ایگریمنٹ لکھاجائے، اس میں گاہک کو سامان خریدنے کے لیے وکیل بنانے کا معاملہ تو قطعی اور یقینی ہو لیکن اس ایگریمنٹ میں اجارہ اور بیع کا تذکرہ صرف بطور وعدہ کے ہو، قطعی اور فیصلہ کے طریقہ پر ان کا عقد نہ کیاجائے۔

۲. جب گاہک سامان خرید کر اس پر قبضہ کرلے اوراس کو اپنے ہاں نصب کرلے، اس کے بعد عقد اجارہ بالمشافہہ یامراسلت کے ذریعے کیاجائے اوراس عقد اجارہ کے وقت بیع کا تذکرہ نہ کیاجائے۔

۳. سامان کی خریداری کے بعد اور عقد اجارہ ہونے سے پہلے وہ سامان بینک کی ضمان میں رہے گا۔

۴. اگر فریقین میں کوئی ایک وعدہء اجارہ یاوعدہء بیع کی خلاف ورزی کرے گا تو اس وعدہ خلافی کے نتیجے میں فریق ثانی کو جو مالی نقصان ہو گا فریق اول اس نقصان کی تلافی کرے گا۔ (۱)

اسلامی بینکوں میں جاری شدہ مرابحہ میں وکالت

گاہک جب بینک کے پاس آکر سامان یاآلات یامشینری وغیرہ کی خریداری کے لیے بینک سے سرمایہ کاری کا مطالبہ کرتاہے تو بینک اس کو ان اشیاء کی خریداری کے لیے سود پر قرض فراہم کرنے کے بجائے گاہک کی مطلوبہ اشیاء پہلے خود اپنے لیے بازار سے خرید لیتاہے، اور پھر وہ اشیاء مرابحہ مؤجلہ پر گاہک کو فروخت کردیتاہے۔ لیکن عملی طور پر اکثر بینکوں میں یہ ہوتاہے کہ بینک وہ اشیاء خود نہیں خرید تابلکہ وہ گاہک کو اپناوکیل بنادیتاہے کہ تم میرے وکیل بن کر بازار سے فلاں چیز جو ان اوصاف کا حامل ہو، خرید لو۔ جب گاہک اس چیز پر بینک کے وکیل کی حیثیت سے قبضہ کرلیتاہے تو پھر اس کے بعد گاہک مرابحہ مؤجلہ کے ذریعے وہ چیز بینک سے خرید لیتاہے۔

---

(۱) محمد تقی عثمانی، فقہی مقالات، ۶/۱۲۹

البتہ اس صورت میں یہ ضروری ہے کہ گاہک بحیثیت وکیل کے اپنے فرائض انجام دیتے ہوئے ان اشیاء کو خریدنے کے بعد ان کا رسک بینک کی طرف منتقل کردے، اور پھر ان اشیاء کو بینک سے خریدنے کے لیے از سرِ نو بینک کو اوفر (ایجاب) کرے اور بینک گاہک کی اس اوفر کو قبول کرے۔(۱)

نتائج

عقد وکالہ کے ارکان، صفات اور اس کے تقاضے مکمل طور پر ہونے چاہیے ورنہ معمولی بے اصولی کی وجہ سے کئی موقعوں پر معاملہ براہ راست سود کے زمرے میں چلا جاتا ہے۔

سفارشات

۱۔ وکیل کے لیے ضروری ہے کہ وہ جس معاملے میں بھی وکالت کی خدمت سرانجام دے رہا ہے، چاہے وہ وکیلِ مقدمہ ہے یا مالی لین دین میں وکیل ہے وغیرہ، کم از کم اس معاملے سے متعلق جس طرح فنی معلومات سے واقف ہونا ضروری ہے، اسی طرح شرعی لحاظ سے بھی اس معاملے کو اچھی طرح سمجھنا اور پھر اس کی شرائط وغیرہ کا علم ہونا اور نیز اس کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے تاکہ عند اللہ یہ وکالت مؤاخذہ اور وبال کا ذریعہ نہ بن سکے۔

۲۔ اسلامی بینکوں کو چاہیئے کہ تربیتی کورسسز کے ذریعے اپنے عملے کو وکالت کے احکام اور عملی طور پر ان کی تطبیقات سے آگاہ کریں۔

۳۔ اسلامی بینکوں پر لازم ہے کہ وہ وکالت کی حقیقی صورتوں کو عملی جامہ پہنائیں اور گاہک کو وکیل بنانے سے گریز کریں تاکہ سودی معاملات سے مشابہت نہ ہو سکے۔

۴۔ نگران کمیٹیاں یا شریعہ بورڈز کو چاہئے کہ تورق جیسے معاملات کی اجازت صرف حقیقی ضرورتوں کی صورت میں ہی دیں، اور اسلامی اداروں کو اپنی مجموعی سرگرمیوں میں ان معاملات کو کم کرنے کی تاکید کریں، خصوصاً توکیل والے معاملے کے تمام مراحل کی ٹھیٹ نگرانی کریں، تاکہ معاملہ سودی معاملہ کے مشابہ نہ ہوں۔

۵۔ اسی طرح حقوق اللہ اور حقوق العباد کے اعتبار سے وکالت کی جو صورتیں جواز عدم کے حوالے سے بنتی ہیں ان کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے یعنی یہ بات ملحوظ رہے کہ کن چیزوں میں وکالت کرنا درست ہے اور کن میں درست نہیں۔

---

(۱) عثمانی، محمد تقی، اسلام اور جدید معاشی مسائل، ادارہ اسلامیات لاہور، ۲۰۰۸ء، ۲۲۹/۳

برصغیر کے نو مسیحی مصنفین کی سوانح عمریوں کی فنّی، تاریخی اور مذہبی حیثیّت کا جائزہ

An Analysis of Technical, Historical and Religious Status of Biographies of Converted Christian Writers of the Sub-Continent

شگفتہ نوید*
ڈاکٹر محمد ریاض محمود**

ABSTRACT

The British colonial rule in the Indian Sub-Continent created a lasting social, cultural and religious impact on the lives of the local people. Islam was specially treated as a grave threat by the colonial government, and it took a number of steps against Islam to undermine it. Literature carrying highly provocative and incendiary material against Islamic beliefs and traditions was produced by the priests in tacit connivance of the British government. It resulted in the conversion of some Muslims to Christianity who wrote their tales of conversion in the form of autobiographies in which they subjected both Islam and Muslims to severe criticism. They tried to discredit the Qur'ān, Ḥadīth, Sīrah and Taṣawwuf and made fun of the different eras of the Muslim history with a view to promote hatred from for Islamic values among Muslims. Such criticism of Islam by these new converts needed to be countered and answered in a balanced way. The present study, therefore, presents an overview of the specific Christian literature against Islam in order to fulfill the scholarly needs of the subject. The scholarly work on this topic will offer a strong defense of Islam and the Islamic values against the external attacks.

Keywords: *Autobiography, Biography, Christianity, Conversion, India, Islam, Priest, The British.*

* پی ایچ۔ڈی سکالر، شعبہ علومِ اسلامیہ، گفٹ یونیورسٹی، گوجرانوالہ
** اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علومِ اسلامیہ، یونیورسٹی آف گجرات، گجرات

موضوعِ تحقیق کا تعارف اور اس کی علمی و فکری اہمیت

برصغیر میں برطانوی نو آبادیات نے سیاسی، سماجی اور مذہبی اعتبار سے اہم تغیّرات کو جنم دیا۔ انگریز نے مسلمانوں کی مُغل حکومت کا خاتمہ کر کے اقتدار حاصل کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے سیاسی استحکام کے لئے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بھرپور منصوبہ بندی کی۔ اسلام کی تنقیص و تردید اور مسیحیت کے فروغ کے لئے ہمہ جہتی اقدامات کئے گئے۔ مختلف ممالک سے پادری بُلائے گئے اور اسلام مخالف ماحول ترتیب دیا گیا۔ اسلامی عقائد و روایات کے خلاف اشتعال و نفرت پر مشتمل کُتب تحریر کرائی گئیں۔ اسلام پر علمی و فکری حملے کرائے گئے، قرآن و حدیث اور سیرت و تصوف پر اعتراضات کئے گئے، نظامِ تعلیم کو یکسر بدل دیا گیا، اسلامی تاریخ کے مختلف مراحل کا تمسخر اُڑایا گیا، اسلامی تہذیب و تمدن پر معاندانہ تبصرے کئے گئے، سامراجی حکومت کا ہدف یہ تھا کہ مسلمان اپنے مذہب سے بیگانہ اور متنفر ہو کر حلقہ مسیحیت میں داخل ہو جائیں۔ انگریز حکومت اور مسیحی پادریوں کی اس شرمناک سازش کو بے نقاب کرنے کے لئے مسلم علماء نے جرأت کا مظاہرہ کیا اور دفاعِ اسلام کا عظیم الشان علمی معرکہ انجام دیا۔ انہوں نے حکومتی فریب اور مبنی بر اشتعال کُتب کی حقیقت کو ہندوستان کے عام لوگوں خصوصاً مسلمانوں پر واضح کیا۔ انہوں نے اسلام پر لگنے والے الزامات کا جواب دیا، مسیحیوں کی علمی کمزوریوں کی نشاندہی کی، مسلمانوں کو مایوس ہونے سے بچایا اور اسلامی تہذیب و ثقافت کی شان و شوکت کے مختلف پہلو واضح کئے۔ اس ضمن میں مسلم علماء نے مضبوط علمی دلائل پر مشتمل جوابی کُتب تحریر کیں اور مسیحی پادریوں کو بالمشافہ مناظروں میں شکست سے دوچار کیا۔ مسلم علماء کی دفاعِ اسلام کی یہ جدوجہد انسانوں کی علمی تاریخ کا ایک شاندار باب ہے۔ اسلام کے عقائد و نظریات اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کے بھرپور تحفظ و دفاع کے باوجود چند مسلمان اسلام سے متعلق تشکیک کا شکار ہو کر مسیحی ہو گئے۔ ترکِ اسلام کر کے مسیحیت قُبول کرنے والے ان لوگوں میں بعض نے اپنی تبدیلیٔ مذہب کی رُوداد کو "آپ بیتی" کی صورت میں پیش کیا۔ بعض نو مسیحیوں کے احوال کو اُن کی "سوانح عمری" میں کسی اور مصنف نے بیان کیا۔ نو مسیحی خواتین و حضرات کی یہ آپ بیتیاں اور سوانح عمریاں مسیحیوں کے پیش کردہ اسلام سے متعلق انتقادی ادب کا ایک اہم حصہ ہیں۔ تعصُّب و نفرت پر مبنی اس مذہبی ادب میں نو مسیحی لوگوں کے ذاتی و خاندانی حالات کے بیان کے ساتھ ساتھ اسلام اور مسلمانوں پر سخت تنقید موجود ہے۔ مسلمانوں کے خلاف ایسے الزامات اور اشکالات پیش کئے گئے ہیں جن کا علمی جواب دیا جانا نہایت ضروری ہے۔ اس سوانح ادب کا مطالعہ و تجزیہ اسلامی عقائد اور مسلم تشخص کے تحفظ کے لئے بہت مفید ہے۔ قرآن و حدیث، سیرت و فقہ اور مسلم فکر کے دیگر متعلقات کے بارے میں اعتراضات کی تفہیم اور اُن کا مناسب جواب دینے کے لئے ضروری ہے کہ نو مسیحی مصنفین کی آپ بیتیوں اور سوانح عمریوں کی فنّی، تاریخی اور مذہبی حیثیّت کا جائزہ لیا جائے۔ اسی علمی و فکری اور تہذیبی و تاریخی ضرورت کی تکمیل کے پیشِ نظر اس تحقیقی

مضمون کے لئے موضوع کے طور پر "برصغیر کے نو مسیحی مصنفین کی آپ بیتیوں اور سوانح عمریوں کی فنّی، تاریخی اور مذہبی حیثیّت کا جائزہ" کا انتخاب کیا گیا ہے۔

موضوع زیرِ بحث جدید اور منفرد خصائص کا حامل ہے۔ علمی حلقوں میں نو مسیحیوں کی آپ بیتیاں اور سوانح عمریاں کبھی براہِ راست زیرِ بحث نہیں آئیں۔ اس پسِ منظر میں یہ تحقیقی کام بڑی افادیّت کا حامل ہے، اس کی تکمیل سے دفاعِ اسلام کے بہت سے پہلوؤں کی تلاش کی راہ ہموار ہو گی، برصغیر کے نو آبادیاتی نظام کی تفہیم میں مدد ملے گی، مسیحیوں کے تبشیری نظام کے بہت سے پہلو واضح ہوں گے، فروغِ مسیحیت کے ذرائع کا اندازہ ہو سکے گا، اُن اسباب و محرکات کا علم ہو سکے گا جو بہت سے لوگوں کے قُبولِ مسیحیت کے پس منظر میں موجود تھے، مذاہب کے تقابلی مطالعات کے ضمن میں یہ ایک قابلِ قدر علمی کام ہو گا۔ مضمون ہذا میں علمی مباحث کو پانچ اجزاء میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے جُزو میں موضوعِ تحقیق کا تعارف کرایا گیا ہے اور اس کی علمی و فکری اہمیت واضح کی گئی ہے۔ دوسرے جُزو میں آپ بیتیوں اور سوانح عمریوں کا مفہوم اور اُن کی فنّی نوعیت کو واضح کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں علم وادب سے وابستہ ماہرین کے اقتباسات سے ہر دو اصنافِ ادب کی نوعیت و حیثیّت کو واضح کیا گیا ہے۔ تیسرے جُزو میں نو مسیحیوں کی آپ بیتیوں اور سوانح عمریوں کی تاریخی و مذہبی حیثیّت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ چوتھا جُزو سفارشات سے متعلق ہے۔ پانچواں اور آخری جُزو خلاصہ بحث پر مشتمل ہے۔

آپ بیتیوں اور سوانح عمریوں کا مفہوم اور ان کی فنّی نوعیّت

ایک دوسرے کے حالات وواقعات اور تجربات و تجزیات سے سبق سیکھنا انسانی فطرت ہے۔ انسان زمانۂ قدیم سے ہی اپنی ذات اور اپنے موقف کے اظہار کے لئے مختلف طریقے اختیار کرتا آیا ہے۔ آپ بیتیاں اور سوانح عمریاں بھی انسانوں سے متعلق حقائق جاننے کے ذرائع ہیں۔ کسی تجربہ کار اور ماہر انسان کے احوال و کوائف، اس کی حرکات و سکنات، اس کے اقوال و ملفوظات، اس کے تجربات و مشاہدات، محسوسات و نظریات اور پسند و ناپسند سے متعلق مستند و معتبر معلومات یقیناً علم و حکمت کا بیش قیمت ذخیرہ ہوتی ہیں۔ اس سے اس شخص کی زندگی کے اُتار چڑھاؤ کا علم ہوتا ہے، یہ علم کسی تجسُّس کی تشفی بھی ہے اور حُصولِ عبرت کا ذریعہ بھی۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے اہلِ بصیرت اور انسانیّت کی خیر چاہنے والے لوگوں نے اپنے حالات و خیالات کو تحریر کیا۔ اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے حالات خُود تحریر کرے تو اُسے "آپ بیتی" یا "خود نوشت" کہا جائے گا اور اگر کسی شخص کے حالات کو کوئی دوسرا شخص ضبطِ تحریر میں لائے تو یہ "سوانح عمری" کہلائے گی۔ انگریزی میں آپ بیتی کو "Autobiography" جبکہ سوانح عمری کو "Biography" کہتے ہیں۔ دونوں اصنافِ ادب کثیر الجہات مقاصد کی حامل ہیں۔ "آپ بیتی" کی نوعیت اور اس کے خصائص کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی نے لکھا ہے:

> "فن خود نوشت ادب کی ایک معروف اور مفید صنف ہے۔ اس سے بنی نوع انسان کو ایک دوسرے کے تجربات و مشاہدات اور احوال و کوائف سے آگاہی ہوتی ہے۔ اس صنف کا

آغاز وارتقاء صدیوں پر محیط ہے، انسان ابتداء سے اپنی ذات اور تجربات کے اظہار کے لئے نت نئے طریقے اختیار کرتا رہا ہے۔ یہ فی الواقع انسان کے اس جذبۂ تجسس کی مظہر ہے جس کے باعث وہ اپنے گرد وپیش کو جاننے اور سمجھنے کی سعی کرتا ہے۔ کائنات کے بے پناہ مسائل اور اسرار ورموز سے واقفیت رکھنے والے شخص کی یہ فطری خواہش ہو گی کہ وہ اپنے دوسرے بھائیوں سے تجربات ومشاہدات اور حقائق ومعلومات کا تبادلہ کرے۔ اس سے وہ صرف ایک دوسرے کے تجربات سے آگاہ ہی نہیں ہوتا بلکہ خود کو ذہنی آسودگی اور سکون فراہم کرتا ہے۔ کیونکہ اپنی ذات تک پہنچنے کا اس کے پاس یہی واحد راستہ ہے۔"(۱)

آپ بیتی کے مفہوم، نوعیّت اور اجزائے ترکیبی کا دامن بڑی وُسعت کا حامل ہے۔ یہ کسی شخص کی وہ کہانی ہے جسے وہ خُود اپنی صلاحیّت اور انداز کے مطابق بیان کرتا ہے۔ کوئی قاعدہ یا ضابطہ اس کی مرضی پر عمل کرنے کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتا۔ وہ چاہے تو اپنی بات کو اپنے حسب نسب سے شروع کرے یا خاندانی کوائف اور ان کے مذہبی، سیاسی، سماجی اور کاروباری پس منظر کو واضح کرے۔ محمد طفیل نے آپ بیتی کی تعریف وتشریح اِن الفاظ میں کی ہے:

"کسی انسان کی زندگی کے تجربات، مشاہدات، محسوسات، نظریات اور عقاید کی ایک مربوط داستان ہوتی ہے۔ جو خود اس نے بے کم وکاست اور راست راست قلم بند کر دی ہو، جسے پڑھ کر اس کی زندگی کے نشیب وفراز معلوم ہوں۔ اس کے نہاں خانوں کے پردے اُٹھ جائیں اور ہم اس کی خارجی زندگی کے سوا اس کی داخلی کیفیات کے حجرے میں بھی جھانک کر دیکھ سکیں۔"(۲)

آپ بیتی میں درج معلومات کا انحصار صاحبِ کتاب کی مرضی اور نیّت وارادہ پر ہوتا ہے۔ اُسے اختیار ہوتا ہے کہ وہ جس منظر اور پہلو کو چاہے تو بیان کر دے اور چاہے تو مخفی رکھے اور نظر انداز کر دے۔ آپ بیتی شخصی وانفرادی تجربے، داخلی احساسات وجذبات اور مافی الضمیر کے اظہار کا ایک اہم ذریعہ ہُوا کرتی ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"آپ بیتی محض احوال وواقعات کا مجموعہ نہیں ہوتی، بلکہ اکثر اوقات لکھنے والے کی داخلی کیفیتوں، دلی احساس، شخصی اور عملی تجربوں، زندگی کے جذباتی پہلوؤں اور بحیثیت مجموعی زندگی کے بارے میں اس کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتی ہے۔"(۳)

---

(۱) اصلاحی، ڈاکٹر صفدر سلطان، عربی زبان میں خود نوشت سوانحی ادب کا ارتقاء، مسلم یونیورسٹی، شعبہ کلیات، علی گڑھ، حکیم اجمل خان طبیہ کالج، ۲۰۱۶ء، مقدمہ، ص:۷

(۲) محمد طفیل، مجلہ "نقوش" آپ بیتی نمبر، تصریحات، ادارہ فروغ اردو، لاہور، جون ۱۹۶۴ء

(۳) ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، اصنافِ ادب، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص:۱۶۶

آپ بیتی کو علم و عرفان، شعور و معرفت، تحقیق و تلاش، تنقیح و تنقید، تفہیمِ ذات اور ترسیلِ فکر و خیال کا ایک معتبر و مؤثر وسیلہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی غیر معمولی اہمیت وافادیت نے آپ بیتیوں کی تحریر و تسوید کو روانی اور وُسعت عطا کی ہے۔ یہ علم و فکر کے بہت سے مخفی خزائن کی دریافتوں کا باعث ہو سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب اور ادبیات سے وابستہ بہت سے محققین نے اس نادر علمی ورثہ سے ہر دور میں استفادہ کی کوشش کی ہے۔

نو مسیحیوں کی آپ بیتیوں اور سوانح عمریوں کی تاریخی و مذہبی حیثیّت

آپ بیتیوں اور سوانح عمریوں میں درج مباحث کا بلاواسطہ یا بالواسطہ تعلق مختلف افراد و اقوام سے ہوتا ہے۔ ان میں بہت سے مذہبی، سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی پہلو زیر بحث آتے ہیں۔ نادر معلومات بیان ہوتی ہیں، امید افزاء اور منفرد دعوے کیے جاتے ہیں، غیر معمولی انکشافات کئے جاتے ہیں، بلاشبہ یہ چیزیں اکثر اوقات حسّاسیّت کو جنم دیتی ہیں۔ یہاں محض حالات و واقعات کا بیان نہیں ہوتا بلکہ مصنف کی رائے بھی ساتھ ساتھ شاملِ متن ہوتی جاتی ہے، ہر شخص کا تجربہ الگ ہے، اس کا تجزیہ و تبصرہ الگ ہے، فطرت و جبلّت الگ ہے، اس کی ذات کے مفادات بھی ہیں، کوئی خاص تاثر قائم کرنا اس کی ضرورت ہو سکتا ہے، اس کے مشاہدات و محسوسات میں نقص واقع ہو سکتا ہے، انسان فطری طور پر اپنی پسند کی اشیاء کا اسیر ہوتا ہے، وہ اپنی ناپسندیدہ اشیاء کو منفی انداز میں بیان کرنے پر مجبور ہوتا ہے، اظہار و بیان میں وہ اپنی صلاحیت کا پابند و محتاج بھی ہے، وہ کسی حقیقت یا منظر کے اُسی رُخ کو واضح کر سکتا ہے جو اس کے فہم کے مطابق ہو، اس کی قلبی واردات کسی دوسرے کے فہم و خیال میں کماحقّہ جگہ نہیں پا سکتی، مصنف کے ہاں کامیابی قرار پانے والے اجزاء کسی دوسرے کے ہاں ناکامی کا نشان ہو سکتے ہیں، اس کے دعوؤں کے پیچھے اس کے جذبات ہوتے ہیں، اس کی داخلی کیفیات اس کے دل و دماغ پر غالب رہتی ہیں، اُس کا دلی احساس یا عملی تجربہ دیگر انسانوں سے مختلف و منفرد ہو سکتا ہے اور اس کی خود پسندی اس کے قلم پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ اسی نوعیّت کے بہت سے ایسے پہلو موجود ہیں جو آپ بیتیوں اور سوانح عمریوں میں تحریر کئے گئے بہت سے بیانات اور دعوؤں کو غیر معتبر، مشکوک اور مبنی بر آمیزش و تصنّع قرار دلا سکتے ہیں۔ اس پس منظر میں بہت ضروری ہے کہ آپ بیتیوں اور سوانح عمریوں میں سے کمزور اور مشکوک پہلوؤں کو تلاش کیا جائے، گہرے نقد و نظر کے بعد ہی کسی بیان کو سندِ اعتبار سے نوازا جائے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اکثر اوقات انسان خُود پسند واقع ہوا ہے، وہ خُود سے محبت کرتا ہے، اکثر اوقات وہ دوسروں کو جس معیار پر جانچتا ہے وہ خُود کو جانچتے وقت وہ معیار نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس فطری کمزوری کے تحت آپ بیتی لکھتے وقت مصنف اپنے آپ کو ایک غیر معمولی انسان بنا کر پیش کرتا ہے، وہ اپنے قاری کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ آپ بیتی میں مبالغہ آرائی اور اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش نظر آتی ہے۔ اُصول، دیانت اور شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ بیتی میں غلطیوں اور کوتاہیوں کا اظہار و اقرار ہو اور مصنف

اعتدال و توازن اور تناسب سے کام لے۔[۱] آپ بیتی میں مصنف کے حالات کے علاوہ ارد گرد کے لوگوں کی شخصیت اور کردار پر بھی بات ہوتی ہے، اس طرح آپ بیتی ذہنی و نفسیاتی رُجحانات کی عکاس ہوتی ہے۔

برصغیر کا نو آبادیاتی دور مذہبی اور علمی حوالوں سے بڑی حسّاسیّت کا حامل ہے۔ انگریز نے اپنے اقتدار کی مضبوطی کے لئے مسیحی مذہب کا سہارا لینے کی بھرپور کوشش کی۔ مسیحی پادریوں نے اسلام مخالف کُتب تحریر کیں۔ اشتعال اور منافرت پر مبنی مذہبی ادب تخلیق کیا گیا۔ بیرونِ ملک سے پادریوں کو بُلایا گیا تاکہ مقامی پادریوں کی حوصلہ افزائی اور تربیت کا سامان ہو سکے۔ حکومت کی اس حکمتِ عملی کے نتیجے میں جرمنی، فرانس اور برطانیہ سے متعدد پادری ہندوستان آ گئے۔[۲] مسیحیت کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ سابقہ حکمرانوں کے مذہب یعنی اسلام کے خلاف زہریلا پروپیگنڈا شروع کر دیا گیا۔ مسیحی مشن کی پُشت پر حکومتِ وقت کھڑی تھی، سیاسی طاقت اور سرمایہ کی فراوانی نے بہت سی مشکلات کو آسانیوں میں بدل دیا تھا۔ اسلام کی ہر نشانی اور علامت مسیحی پادریوں کے نشانے پر تھی۔ مسلم اوقاف کو ختم کر دیا گیا، قانونِ وراثت تبدیل کر دیا گیا، فہمِ اسلام میں مدد فراہم کرنے والی زبانوں یعنی عربی، فارسی اور اُردو کی ہر میدانِ علم سے فراغت کی حکمتِ عملی اپنائی گئی، ان زبانوں کی جگہ انگریزی زبان کے فروغ کے لئے بھرپور اقدامات کئے گئے۔ اسلام پر علمی حملوں کی راہ ہموار کی گئی، پیغمبرِ اسلام ﷺ پر علمی، سیاسی، سماجی، نفسیاتی، جذباتی اور ذاتی حوالوں سے اعتراضات اور الزامات کی بوچھاڑ کر دی گئی، قرآنِ مجید پر تعصُّب و نفرت پر مبنی تبصرے جاری کئے گئے، حدیثِ نبوی ﷺ کے متن اور اس کی تاریخ و تدوین کا مذاق اُڑایا گیا، تصوف کو اسلامی روایت کے خلاف بغاوت قرار دیا گیا، معاندانہ مذہبی کتب کی اشاعت کے لئے تیز رفتار اقدامات کئے گئے، نظامِ تعلیم پر حملہ کیا گیا، اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کے تہذیب و تمدن کی تردید و مذمّت کے لئے ہر حربہ استعمال کیا گیا۔ حکومت اور مسیحی پادریوں کی خواہش اور منصوبہ بندی یہ تھی کہ مسلمان اپنے مذہب سے بددل اور متنفر ہو جائیں، دل برداشتہ ہو جائیں، اسلام ترک کر کے مسیحیت کو قبول کر لیں، اگر ایسا نہ ہو سکے تو کم از کم ان کے عقائد میں پختگی کا عنصر کمزور پڑ جائے، اُن کی محبتِ رسول کی روش پر زد پڑے، وہ تشکیک و تذبذب کے اندھیروں میں گم ہو جائیں۔[۳] ان اقدامات نے برصغیر کے مذہبی، سیاسی اور سماجی ماحول کو نفرت و اشتعال کے حوالے کر دیا۔

مسیحیت کی ترویج و اشاعت کے لئے جو اقدامات کئے گئے ان کی حقیقت واضح کرنے اور زہریلے پروپیگنڈے کا جواب دینے کے لئے مسلم علماء نے جرأت مندانہ کردار ادا کیا، انہوں نے اس سرکاری روش اور الزاماتی ماحول کے مختلف پہلوؤں پر سنجیدگی سے غور و خوض کیا اور دفاعِ اسلام کے لئے متحرک و فعّال کردار ادا کر کے تاریخ ساز نتائج

---

(۱) پروفیسر عصیم، ونسینٹ پس، فنِ شخصیت نگاری، نرالی کتابیں، وینس ہاؤسنگ سکیم، فیروز پور روڈ، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص:۹۶

(۲) امداد صابری، فرنگیوں کا جال، فرید بک ڈپو، انڈیا، دہلی، ۲۰۰۶، ص:۱۰۷-۱۳۰

(۳) امداد صابری، فرنگیوں کا جال، ص:۱۴۹-۲۰۲

حاصل کئے۔ اُنہوں نے مسیحی پادریوں کے سیاسی مفادات اور ان کے مذہبی پسِ منظر سے عوام کو آگاہ کیا، پادریوں کی حکمتِ عملی کا مکمل تعاقب کیا، اُن کی مذہبی کمزوریوں کو پوری علمی صلاحیّت کے ساتھ طشت از بام کیا، مسلم عوام میں مایوسی اور نااُمیدی کے جذبات کو پیدا ہونے سے روکا اور اُن میں اسلامی عقائد کے تحفظ کا جذبہ پیدا کیا، مسلمانوں کو اس قابل بنایا کہ وہ اسلامی تہذیب و تمدن کے احیاء پر اصرار کر سکیں، علمی میدان میں شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا گیا، ایسا بے مثال مذہبی ادب تخلیق کیا گیا جس سے مسیحی پادریوں کے پیدا کردہ شکوک و شبہات کو دور کر دیا گیا، اس کے ساتھ ساتھ مسیحیت کے داخلی اختلافات اور علمی کمزوریوں کو واضح کیا گیا، مسیحی فکر میں موجود اُن خامیوں کی نشاندہی کی گئی جنہوں نے مسیحیت کو اس کی اصل راہ سے دور لا کھڑا کیا تھا۔[۱] مسلم علماء نے مسیحی فکر کی تردید کے لئے سنجیدہ اُسلوب اختیار کرتے ہوئے مضبوط دلائل پر مشتمل کُتب تحریر کیں اور مسیحی پادریوں سے مناظرے کئے۔ اس ساری علمی و عملی جدوجہد کے نہایت مثبت اثرات بر آمد ہوئے۔ دفاعِ اسلام کی اس متحرک اور جاندار حکمتِ عملی کے باوجود چند مسلمان اپنے ایمان کو قائم نہ رکھ سکے، انہوں نے اسلام کو خیر باد کہہ دیا اور مسیحیت کو قُبول کر لیا۔ اُن نو مسیحیوں میں مختلف علمی درجوں کے لوگ شامل تھے۔ اُن میں کچھ اہلِ قلم بھی تھے جنہوں نے بعد ازاں ترویجِ مسیحیت کے لئے بھرپور کوششیں کیں۔ انہوں نے اپنے سابقہ مذہب یعنی اسلام پر بھی اعتراضات بیان کئے۔[۲] ان میں سے بعض حضرات نے اپنی تبدیلیٔ مذہب کی کہانی کو کتابی شکل دیتے ہوئے "آپ بیتی" تحریر کر دی۔ بعض حضرات ایسے ہیں جن کی قُبولِ مسیحیت کی رُوداد کو اُن کی زندگی میں یا اُن کے انتقال کر جانے کے بعد "سوانح عمری" کی شکل میں کسی دوسرے مصنف نے مدوّن کیا۔

برصغیر میں یورپی اقوام کی آمد خصوصاً برطانوی سامراج کا غلبہ عالمِ مسیحیت کا ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔ اسلام کے خلاف نفرت کو عام کرنا اور مسیحیت کی قُبولیّت کے لئے راہیں ہموار کرنا اس منصوبے کے اہداف میں خصوصی طور پر شامل تھا۔ مذہب کو تبدیل کرنے کی مہم کی تشہیر سرکاری سطح پر اسی لئے کی جارہی تھی کہ سابقہ حکمرانوں کے مذہب کے نشانات کو مٹا دیا جائے، اسلام کو خیر باد کہنے والوں کی ستائش کی جارہی تھی، مسیحیت قُبول کرنے والوں کو اعزازات اور سہولیات سے نوازا جارہا تھا۔ مسیحی حلقوں کے لئے اس حوصلہ افزاء ماحول نے اسلام چھوڑنے والوں کو یہ ہمت دی کہ وہ اسلام کے خلاف توہین آمیز لب ولہجہ اختیار کریں۔ ذیل میں نو مسیحی مسنفین کا تذکرہ کریں گے جنہوں نے اسلام ترک کر کے مسیحیت کی راہ اپنائی۔

پادری صفدر علی دھول پور (م۱۸۹۹ء) آگرہ کے ایک مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے اُن کا سنِ پیدائش ۱۸۳۰ء

---

(۱) مہانی، سید آلِ حسن، کتاب الاستفسار، تحقیق: ڈاکٹر خالد محمود، دارالمعارف، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص:۳۹۱

(۲) عمادالدین، پادری، واقعاتِ عمادیہ، پنجاب ریلیجئس بک سوسائٹی، لاہور، س،ن، ص:۱۷؛ سلطان محمد پال، پادری، میں مسیحی کیوں ہو گیا؟، پنجاب ریلیجئس بک سوسائٹی، لاہور، س،ن، ص:۶

ہے،[۱] بچپن میں والدین وفات پا گئے تھے، حالات کی ابتری کے باوجود اُنہوں نے تعلیم کے معاملہ میں خوب دلچسپی لی۔[۲] گورنمنٹ کالج آگرہ میں مسیحی اساتذہ سے روابط کے نتیجے میں مسیحیت کی طرف راغب ہوئے۔[۳] یہ اپنے دوست عمادالدین کے ہمراہ ایک مسلم عالمِ دین عبدالحلیم سے ملے مگر مسیحیت سے رغبت میں کمی نہ آسکی، بعد ازاں ۱۸۶۵ء میں اسلام چھوڑ کر مسیحیت کو قُبول کر لیا، مسیحی حلقوں میں نمایاں خدمات انجام دیں، فارسی و فلسفہ کے استاد رہے، ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے طور پر کام کیا۔ "نیاز نامہ" ان کی وہ کتاب ہے جس میں انہوں نے تفصیل سے اپنی تبدیلیٔ مذہب کی رُوداد کو قلم بند کیا۔ اُن کی دیگر کتب میں "غذائے روح" اور "دجال مسیح" نمایاں ہیں۔[۴] اُنہوں نے اپنی منفرد آپ بیتی کو تمام مسلمانوں کے نام ایک کُھلے خط کے طور پر تحریر کیا ہے، کتاب کے سرِ ورق پر لکھا گیا ہے کہ یہ وہ خط عام ہے جس کو مولوی صفدر علی انسپکٹر مدارس جبل پور متوطن اکبر آباد نے بجواب خطوط اپنے احباب و آشنایان ممالک مغربی و مشرقی کے لکھا۔[۵] مصنف نے دوستوں کے خطوط کے جواب میں ۳۰۸ صفحات پر مشتمل ایک طویل تحریر تیار کی اور واضح کیا کہ کیوں اُس نے دینِ اسلام کو ترک کیا اُس کا دعویٰ ہے کہ دینِ محمدی یعنی اسلام کسی بھی صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہے، مزید یہ کہ حضرت محمد ﷺ بھی اللہ تعالیٰ کے رسول نہیں ہیں۔ اُس کا دعویٰ ہے کہ مسیحیت سچا دین ہے اور خدا کی طرف سے ہے، وہ کہتا ہے کہ ساری انسانیت کی نجات کا دارومدار حضرت مسیح علیہ السلام پر ہے، وہی گناہ گاروں کی شفاعت کریں گے۔[۶] اُس نے بڑی تفصیل کے ساتھ بائبل کی صحت پر دلائل دیئے ہیں اور مسلمانوں کے ان دعوؤں کی تردید کی ہے کہ بائبل میں تحریف ہوئی ہے یا وہ منسوخ ہے۔ اسلام سے متعلق اس کے اشکالات کو درج ذیل نکات کی صورت میں واضح کیا جاتا ہے۔

ا۔ قرآن و حدیث نے کتابِ مقدس کو اللہ تعالیٰ کا کلام قرار دیا ہے اور اس کی صداقت کی کامل شہادت دیتے ہیں مگر اسی کے مطالب و مقاصد کے برخلاف تعلیم بھی دیتے ہیں، لہذا کامل یقین ہے کہ قرآن کلام اللہ نہیں اور نہ حدیث خدا کی طرف سے الہام ہے۔[۷]

ب۔ کتابِ مقدس کے محرف اور منسوخ ہونے کے بارے میں مسلمانوں کے دعوے غلط ہیں۔[۸]

---

(1) Khokhar ,Emanual, Rev, *Who is Who (Missions among Muslims)*,(South Korea: Yehyang Presbyterian, Church Seoul, 2006AD),180

(۲) یاد، یوسف مسیح، خدمت گزار سے دار بردار تک، مسیحی مشاہیر از گریفن جونز شرر، حصہ دوم، کرسچن رائٹرز گلڈ، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص:۱۶۷

(۳) عمادالدین، پادری، واقعاتِ عمادیہ، ص:۴

(۴) یوسف مسیح یاد، خدمت گزار سے دار بردار تک، مسیحی مشاہیر، حصہ دوم، ص:۱۶۷

(۵) صفدر علی، پادری، نیاز نامہ، مشن پریس، الہ آباد، ۱۸۶۷ء، ص:۱

(۶) ایضاً، ص:۲-۶

(۷) ایضاً، ص:۶-۸

(۸) ایضاً، ص:۷۵-۷۷

مسلم علماء جب کتابِ مقدس کی تحریف ثابت نہ کر سکے تو اُنہوں نے تحریف کے معنٰی ہی بدل دیئے اور اُن باتوں کو تحریف بتلایا جن سے کوئی کتاب محرف نہیں ہوتی۔ (۱)

پادری عماد الدین پانی پتی (م ۱۹۰۰ء) نے غیر ملکی پادری ہنری رابرٹ کلارک کے ہاتھ پر مسیحیت سے وفاداری کا عہد کیا، اُس وفاداری کو ثابت کرنے کے لئے اُس نے اسلام کے خلاف کُتب و مقالات تحریر کرنے کا وسیع سلسلہ شروع کیا، اپنی قُبولِ مسیحیت کی کہانی کو "واقعاتِ عمادیہ" کے نام سے تحریر کیا، برصغیر کے مذہبی ادب میں یہ مخاصمانہ نوعیت اور انتشار واشتعال پر مبنی خصائص کی حامل آپ بیتی ہے۔ اسلام کو خیر باد کہہ کر حلقۂ مسیحیت میں داخل ہونے والے معروف مسیحی مبلغ و مصنف پادری عمادالدین نے اس میں اپنی قُبولیّتِ مسیحیت کی رُوداد کو تحریر کیا ہے۔ مولوی کریم الدین اُن کے بڑے بھائی تھے اور دہلی کالج سے تعلیم یافتہ تھے، وہ آگرہ کالج میں تدریس کرتے تھے، عمادالدین نے وہیں اُن کی نگرانی اور رہنمائی میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مولوی کریم الدین پنجاب آگئے اور محکمہ تعلیم سے وابستہ ہوگئے، عمادالدین بھی اُن کے ساتھ لاہور آگئے۔ اسی جگہ اُنہیں میگن تاش ہیڈماسٹر نارمل اسکول لاہور سے ملنے کے مواقع میسر آئے۔ اُن سے عمادالدین نے بائبل کی تعلیم پائی۔ انہی دنوں صفدر علی نے مسیحیت قبول کرلی۔ یاد رہے کہ یہ صاحب قیامِ آگرہ کے زمانے میں عمادالدین کے دوست تھے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ۲۹ اپریل ۱۸۶۶ء کو عمادالدین نے پادری ہنری رابرٹ کلارک کے ہاتھ پر امرتسر میں مسیحیت کو قُبول کرلیا۔ (۲) قُبولِ مسیحیت کے بعد اُس نے اسلام کی مخالفت اور مسیحیت کی حمایت میں کُتب اور رسائل لکھے۔ عمادالدین کی کتب اُن ہدایات کا نتیجہ تھیں جو وہ مغربی دُنیا سے آئے ہوئے پادریوں سے حاصل کیا کرتے تھے۔ یوسف مسیح یاد جن کا تعلق مسیحیت سے ہے، وہ لکھتے ہیں:

> "پادری رابرٹ کلارک کی طبیعت نے عمادالدین پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ وہ پادری صاحب کے مغربی علماء کے خیالات کو مشرقی رنگ میں سپردِ قلم کرتے رہے۔" (۳)

یاد رہے کہ اُنہوں نے چھتیس برس کی عمر بطور مسلمان گزارنے کے بعد مسیحیت کو قُبول کیا۔ عماد الدین کے بیان کے مطابق وہ بہت سے علمی و فکری اور روحانی مراحل سے گزرنے کے بعد مسیحی ہوئے۔ اسے اسلام سے متعلق تشکیک پیدا ہوئی، صوفیانہ تجربات سے گزرے، ترکِ دُنیا اور چلہ کشی کی راہ بھی اختیار کی، ایک مرحلہ ایسا آیا کہ تمام مذاہب سے بیزار ہوگئے اور مذہبی فکر و خیال کو بے مقصد سمجھتے رہے۔ (۴) قُبولِ مسیحیت کے بعد مسیحی حلقوں میں بڑے معروف ہوئے، اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کی تردید اور اہانت کے لئے طویل سلسلۂ تصنیف اختیار کیا، عماد

---

(۱) صفدر علی، پادری، نیاز نامہ، ص: ۷۹-۸۱

(۲) اختر راہی، سید ناصر الدین ابوالمنصور دہلوی اور مسیحی۔ مسلم مناظراتی ادب، مجلہ: عالم اسلام اور عیسائیت، اسلام آباد، اگست ۱۹۹۲ء، ص: ۶

(۳) یوسف مسیح یاد، مسیحی مشاہیر، ۱/ ۹۶

(۴) عماد الدین، واقعات عمادیہ، ص: ۱۱، ۱۰، ۵، ۴

الدین نے ستر سال عمر پائی اور ۱۹ اگست ۱۹۰۰ء کو امر تسر میں وفات پائی۔ (۱)

سفر نامہ کی طرز پر لکھی گئی آپ بیتی "سفر دکن" ہے جسے پادری جے علی بخش (م۱۹۰۶ء) نے اگست۔ ستمبر ۱۹۰۴ء میں ترتیب دیا۔ یہ اُن خطبات کا مجموعہ ہے جو مصنف نے ترکِ اسلام اور قُبولِ مسیحیت کے بعد مسلمانوں کے سامنے حیدرآباد دکن میں پیش کئے۔ اس کتاب میں مسلم مسیحی مناظروں کا تذکرہ بھی ہے۔ اسلامی عقائد وروایات کی تردید اور مسیحی فکر وفلیسفہ کی تائید سے یہ کتاب عبارت ہے۔ گناہ، جبر وقدر، بشاراتِ محمدی ﷺ، افضلیتِ عیسیٰ علیہ السلام، کُتبِ سماویہ کی حیثیّت، کفارہ، تجسم، اور تثلیث کے بارے میں مسیحیوں کے موقف کی وضاحت ہی نہیں کی گئی بلکہ مسلمانوں کے موقف پر طرح طرح کے اعتراضات کئے گئے ہیں۔ مسلمانوں پر جبری تبلیغ اور بُزدلی کے الزامات لگائے گئے۔ کتاب کے ادبی ولسانی معیار کو بلند کرنے کے لئے کہیں کہیں اشعار کا سہارا بھی لیا گیا ہے۔ (۲)

پادری سلطان محمد پال (م۱۹۲۶ء) کو مسیحی حلقوں میں بڑی ستائش سے نوازا جاتا ہے، پال نے "میں کیوں مسیحی ہو گیا" کے نام سے وہ حالات لکھے جن میں وہ اسلام سے ناطہ توڑ کر مسیحیت کے دامن گیر ہوا۔ پال نے گناہ اور نجات کے بارے میں اسلام اور مسیحیت کا مطالعہ کیا، اسلامی تصورات سے مطمئن نہ ہو سکا۔ قُبولِ مسیحیت کر کے اسلام کے خلاف کُتب تحریر کرنے کے سلسلے کا آغاز کیا۔ مذکورہ آپ بیتی اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ (۳) قُبولِ مسیحیت کے بعد پال نے نہایت فعّال مسیحی پادری کا کردار ادا کیا، مسیحیوں کے علمی حلقوں میں ان کی قدر و قیمت کا اندازہ ایس۔ کے۔ داس کے اس بیان سے بخوبی کیا جا سکتا ہے:

> "پادری سلطان محمد پال کا نام آج بھی کلیساؤں میں نہایت عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ آپ مناظرہ، بحث وکلام کرنے میں بڑے فصیح و بلیغ شخصیت کے مالک تھے اور اس میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔" (۴)

ادب وافسانہ کے اعلیٰ معیار اور منفرد لسانی ذوق کی حامل آپ بیتی "بشپ سجان ایک صوفی کی داستانِ حیات" ہے، اسے بشپ عبد السبحان (م۱۹۴۲ء) نے تحریر کیا، مصنف عالمانہ اور صوفیانہ مزاج رکھنے والا مسلمان تھا، وہ مسیحی مشنری تعلیمی اداروں کے ماحول سے متاثر ہُوا اور مسیحی ہو گیا۔ ترکِ اسلام کے بعد اُس نے مسلمانوں کے عُلوم وعقائد پر بڑے نازیبا حملے کئے، قرآنی آیات کی غلط تشریحات کرتا رہا، تصوف کی غیر اسلامی تعبیرات بیان کرتا رہا اور

---

(۱) امداد صابری، فرنگیوں کا جال، ص:۲۲۳

(۲) جے علی بخش، پادری، سفر دکن، ص:۱۔۱۷۸ www.muhammadanism.org.Date07-10-2-2017,Time,8:10pm

(۳) سلطان محمد پال، پادری، میں کیوں مسیحی ہو گیا، ص:۱-۲۴

(۴) ایس۔ کے۔ داس، تاریخ کلیسائے پاکستان، جے ایس پرنٹرز، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص:۱۹۱

اسلام کی غیر حقیقی تصویر پیش کرتا رہا۔[۱] پادری امیر اللہ علوی (م ۱۹۶۴ء) نے ترکِ اسلام اور قُبولِ مسیحیت کے اسباب کو بیان کرنے کے لئے "میں زندہ مسیح کے قدموں میں کس طرح پہنچا" کے نام سے مختصر تحریر پیش کی، اُس کا تعلق صوفیاء کے خاندان سے تھا مگر اُس نے مسلم تصوف کو بے کار اور بے نتیجہ ظاہر کیا، اُس نے لکھا کہ اطمینانِ قلب محض مسیحیت کی قُبولیّت میں ہے۔[۲] یہ چھ صفحات پر مشتمل آپ بیتی ہے جس میں مصنف نے اپنے خاندانی پس منظر، احساسِ یتیمی، مشنری سکولوں میں ابتدائی تعلیم و تربیت، اپنے خاندان کا صوفیانہ سلسلہ سے وابستہ ہونا، مشنری ہسپتال میں بیوی کے علاج، مسیحی پادریوں سے ملاقاتوں اور قُبولِ مسیحیت پر اظہارِ اطمینان کو بحث کے موضوعات بنایا ہے۔

پادری برکت اللہ (م ۱۹۷۲ء) نے "کربلا سے کلوری تک" میں اپنے حالات تحریر کئے۔ وہ شیعہ مسلمان گھرانے سے تھا، قُبولِ مسیحیت کے بعد اُس نے بیس سے زائد کُتب تحریر کیں۔ اسلام کے خلاف معاندانہ روش اختیار کی، اپنی آپ بیتی میں اُس نے مسیحی مبشرین کی انسانیت نوازی کی تعریف کی، انجیل کو معتبر قرار دیا، الوہیت مسیح پر دلائل دیئے، کفارہ کی حمایت پر اصرار کیا اور تثلیث کو درست عقیدہ قرار دیا۔ اُس نے ظاہر کیا کہ پورے فہم و شعور کو استعمال میں لا کر اُس نے اسلام چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور حُصولِ نجات کی خاطر اُس نے مسیحیت کو قُبول کر لیا۔[۳]

اسلام چھوڑ کر مسیحیت قُبول کرنے والے اہلِ قلم میں ایک اہم نام پادری عبدالحق (م ۱۹۸۰ء) کا ہے۔ عبدالحق نے "میرے مسیحی ہونے کی حقیقت" کے نام سے ایک مختصر آپ بیتی لکھی۔ وہ ادب و فلسفہ میں ماہر تھا نیز اُردو، فارسی اور عربی سے اچھا شغف رکھتا تھا، مسلمانوں کے خلاف کُتب تحریر کرتا رہا اور مناظرے کرتا رہا، اس نے ترکِ اسلام کے جو اسباب تحریر کئے اُن میں نجات، توحید اور بائبل کی تحریف سے متعلق مسلمانوں کے عقائد و نظریات ہیں۔[۴]

ڈاکٹر ابراہیم دیشمکھ (م ۱۹۸۲ء) نے مسیحی ہونے کے تیس سال بعد "جستجوئے حق" لکھی، وہ مسیحی دوستوں کے توجہ دلانے پر مسیحیت کی جانب راغب ہوا، اُسے قصصِ قرآن سے متعلق اشکالات کا سامنا کرنا پڑا، تحریفِ بائبل کے بارے میں اُس موقف کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جو مسیحیوں کی بابت مسلمان بیان کرتے ہیں۔ بائبل کا مطالعہ شروع کیا، قرآن اور بائبل کے الفاظ و تصورات کے اختلاف کو دیکھ کو اعتراضات شروع کر دیئے۔ جمع و تدوینِ قرآن، قرآنی تصورِ ناسخ و منسوخ اور نُزولِ قرآن کے مراحل سے متعلق اسلامی عقائد و روایات سے غیر مطمئن تھا۔ حدیث کی شرعی قدر و حیثیّت پر بھی اس کے ذہن میں بہت سے سوالات نے جنم لیا۔ بالآخر اسلام چھوڑ دیا اور مسیحی ہو گیا۔ اُس کا اندازِ تحریر مُتاثر کن ہے۔[۵] اسلام سے

---

(۱) عبدالسبحان، بشپ سبحان، ایک صوفی کی داستانِ حیات، مسیحی اشاعت خانہ، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص: ۱۔۹۹

(۲) امیر اللہ علوی، میں زندہ مسیح کے قدموں میں کس طرح پہنچا ص: ۱-۶، www.muhammadanism,org,date10-6-2017,time:5.10pm

(۳) برکت اللہ، پادری، کربلا سے کلوری تک، ص: ۱۔۹، www.muhammadanism,org,date7-9-2017,time:10.5pm

(۴) عبدالحق، پادری، میرے مسیحی ہونے کی حقیقت، ص: ۱-۱۳، www.muhammadanism,org,date10-9-2017,time:10.15pm

(۵) دیشمکھ، ڈاکٹر ابراہیم خان عمر خان، جستجوئے حق، ص: ۱-۵۰، www.muhammadanism,org,date9-7-2017time:9.10pm

متعلق تشکیک پر مبنی یہ اعتراضات غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ مسیحیوں کے بارے میں مسلمانوں کی روایتی فکر پر بھی ڈاکٹر ابراہیم نے شکوک وشبہات کا اظہار کیا ہے۔

بلقیس شیخ (م۱۹۹۷ء) نے انگریزی زبان میں آپ بیتی تحریر کی، عنوان تھا(I Dared to Call Him Father)۔ اس کے تراجم اُردو سمیت مختلف زبانوں میں کرائے گئے۔ اُردو میں اس کا عنوان ہے "میں نے اُسے باپ کہنے کی جرأت کی"۔ مُصنّفہ ایک بڑے زمین دار گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں، سیاست و حکومت میں اُن کو ممتاز مقام حاصل تھا۔ بلقیس شیخ نے اپنی نفسیاتی و جذباتی کیفیات، اوہام اور خوابوں میں آنے والے اشارات کی وجہ سے اسلام سے دُوری اختیار کر لی، قرآن و بائبل کا سطحی مطالعہ کیا، تثلیث کی قائل ہو گئی، قرآن و بائبل میں مذکور قصصِ انبیاء کے اختلاف کا شکوہ کرنے لگی، تحریفِ بائبل سے متعلق مسلمانوں کے موقف کو تسلیم کرنے سے انکار کیا، اسلام کو سخت گیر اور مسیحیت کو انسان دوست مذہب قرار دیا، وہ مصلوبیّت کے مسیحی تصورات کو درست سمجھنے لگی، بالآخر مسیحیت کو قُبول کر لیا اور بقیہ زندگی مسیحیت کی نشر واشاعت میں بسر کی۔

غلام مسیح نعمان (م۱۹۹۸ء) کی خود نوشت "میرا فضل تیرے لئے کافی ہے" کے نام سے ہے۔ قُبولِ مسیحیت سے نصف صدی بعد اُسے ضبطِ تحریر میں لایا گیا۔ مصنف مسیحی ملازمین و افسران کے نرم اور انسان دوست رویّوں سے متاثر ہُوا اور اسلام چھوڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ مسیحیت قُبول کر کے مشنری سرگرمیوں کو اختیار کر لیا۔ وہ جہاد، جبر و قدر اور تصوف سے متعلق اسلامی تصورات کے بارے میں تشکیک کا شکار ہُوا۔ اُس نے مقامی سطح کے مولوی حضرات کے سماجی رویوں پر بھی تنقید کی ہے۔(۱)

آپ بیتیوں کے علاوہ ایسی سوانح عمریاں بھی موجود ہیں جن میں ایسے نو مسیحیوں کے حالات وواقعات کو درج کیا گیا ہے جن کا سابقہ مذہب اسلام تھا۔ بشپ ولیم جی ینگ نے "پادری ایم۔ اسماعیل کے حالات زندگی" تحریر کی، اس کا اُردو ترجمہ جیکب سموئیل شنوا نے کیا۔ پادری ایم-اسماعیل (م۱۸۷۳ء) کے بارے میں تحریر کیا گیا کہ وہ نجات سے متعلق اسلامی تعلیمات سے مطمئن نہ تھا، اِس لئے اُنہوں نے اسلام چھوڑا اور مسیحی ہو گیا۔(۲) وہ ۱۸۳۶ء میں بمبئی میں پیدا ہوا، وہ سید خاندان سے تعلق رکھتا تھا، وہ ایک جذباتی آدمی تھا، اُس کے والد قطب الدین ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے، اُس کی تعلیم و تربیت ایسے ماحول میں انجام پائی جس میں مسیحیت کی مخالفت کی جاتی تھی، اس نے قرآن مجید سے متعلق ابتدائی تعلیم حاصل کر رکھی تھی۔ وہ اُردو اور فارسی زبانیں اچھی طرح جانتا تھا، اُن اسلامی کتب کا خصوصی طور پر مطالعہ کرتا جن میں حضرت مسیح کا تذکرہ ہوتا تھا، البتہ وہ مسیحیت کے ناقد تھا، تعلیمی میدان میں اُس کی کارکردگی

---

(۱) غلام مسیح نعمان، میرا فضل تیرے لئے کافی ہے، ص:۸۰۔ https://www.the-goog-way.com,Date04-09-2017,Time:7.40pm،

(۲) بشپ ولیم جی ینگ، پادری، ایم۔ اسماعیل کے حالات زندگی، مترجم: جیکب سموئیل شنوا، ڈایوسیس، چرچ آف پاکستان، سیالکوٹ، ۱۹۸۹ء ص:۱-۹۱

اچھی تھی، اُسے گورنمنٹ سکول میں داخل کرایا گیا، بعد ازاں انگریزی کی معیاری تعلیم کے لئے اُس کو چرچ آف سکاٹ لینڈ سکول میں داخل کرایا گیا۔ اس سکول میں ہندو، پارسی، مسلم اور دیگر مذاہب کے طلبہ زیرِ تعلیم تھے۔ پادری ٹامس ہنٹر سے متاثر ہو کر ایک طالب علم جس کا نام نصر اللہ تھا، نے مسیحیت کو قُبول کر لیا، اسی دوران اسماعیل کو اُردو کے اُستاد کے طور پر بھرتی کر لیا گیا، اب نصر اللہ اُردو زبان کا سبق محمد اسماعیل سے پڑھتا تھا۔ پادری ہنٹر اور نصر اللہ کے محمد اسماعیل پر گہرے اثرات ہوئے، وہ مسیحیت کی طرف راغب ہو گیا۔ اُس نے ۲۱ اگست ۱۸۵۶ء کو بپتسمہ لیا۔ اُسے اسلام میں واپس لانے کی بہت کوششیں ہوئیں مگر وہ مسیحیت پر قائم رہا۔[۱] اُس نے بمبئی، سیالکوٹ، وزیر آباد اور گجرات میں تدریسی خدمات کے ساتھ مشنری سرگرمیوں میں بڑی فعالیت کے ساتھ حصہ لیا۔ ستمبر ۱۸۷۳ء میں وہ گجرات میں تھا کہ ٹائیفائڈ بخار کی وجہ سے اس کا انتقال ہو گیا۔[۲]

پادری اصغر فضل الٰہی پال نے "خادم حق - آنجہانی ڈاکٹر مہر خان کی کہانی" تحریر کی۔ مصنف نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر مہر خان (م ۱۹۱۵ء) کا خاندان اس وجہ سے مسیحی ہو گیا کہ اسلام باہمی دشمنیوں اور جذبۂ انتقام کے فروغ کا مذہب ہے۔ وہ محبت و صلح کی تلاش میں ڈاکٹر مہر خان مسیحی ہو گیا۔[۳] اُس کا خاندان وسیع رقبہ اراضی کا مالک تھا۔ یہ لوگ عیسی خیل سے تقریباً چار میل کے فاصلے پر واقع ایک بڑے گاؤں میں رہتے تھے۔ یاد رہے کہ قیام پاکستان سے قبل عیسی خیل انتظامی اعتبار سے ضلع بنوں کا حصہ تھا جو کہ شمالی مغربی سرحدی صوبہ میں شامل تھا جبکہ قیام پاکستان کے بعد تحصیل عیسیٰ خیل کو ضلع میانوالی میں شامل کر دیا گیا جو کہ اب پاکستان کے صوبہ پنجاب میں شامل ہے۔ یہ خاندان عیسی خیل میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا اور معاشی طور پر خوشحال تھا۔ ڈاکٹر مہر خان کے والد محمد عبد اللہ خان اور اُن کا پورا خاندان مسلمان تھا۔ محمد عبد اللہ خان اپنے قبیلے کی باہمی چپقلشوں اور انتقام لینے کی مقامی روایات سے نفرت کرتا تھا۔ وہ مناسب موقع کی تلاش میں تھا کہ کوئی پُرامن اور انسان دوست لمحات میسر آئیں۔ انہی دنوں مسیحیت کی تبلیغ کرنے والے پادریوں کی تعلیمات سے وہ متاثر ہوا اور اپنے بیوی بچوں سمیت مسیحی ہو گیا۔ بپتسمہ پانے کے بعد اُس کا نام محمد عبد اللہ خان سے بدل کر عبد المسیح رکھ دیا گیا۔ یہ خاندان مسیحیت کے فروغ میں فعّال ہو گیا۔ مسلمانوں کی طرف سے اس خاندان کو مختلف مشکلات کا سامنا کرنا پڑا مگر وہ اسلام کی طرف واپس نہ آئے۔ یوں ڈاکٹر مہر خان کو مسیحیت اپنے والد کی طرف سے پیدائشی طور پر ملی تھی۔ اُن کے والد کا خیال تھا کہ مار دھاڑ، آپس کی دشمنی اور انتقام محض مسلمانوں کا وصف ہے، وہ امن پسندی کی تلاش میں مسیحی ہو گیا۔ ڈاکٹر مہر خان نے بارڈر پولیس کی ملازمت کی، پھر اُسے ترک کر کے معروف مسیحی پادری ڈاکٹر پینل کے قائم کردہ چرچ مشن ہسپتال بنوں میں ملازم ہو گیا اور انہوں

---

(۱) ایم۔ پادری، بشپ ولیم جی ینگ، اسماعیل کے حالات زندگی، ص: ۵-۷

(۲) ایضا، ص: ۹۱

(۳) اصغر فضل الٰہی پال، پادری، خادم حق، مسیحی اشاعت خانہ، ۳۶۔ فیروز پور روڈ، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص: ۱-۹۳

نے علمِ طب اور فنِ جراحت میں خوب مہارت پائی۔ ڈاکٹر مہر خان مسیحی عقائد کی کھلے عام تبلیغ کرتا، مسلمانوں سے بحث مباحثہ کرتا، بازاروں میں مسیحیت کی تبلیغ کے لئے ٹیم تشکیل دے کر روانہ کرتا اور خود بھی اس کا حصہ ہوتا، ۱۲مارچ ۱۹۱۵ء کی رات ڈاکوؤں نے اُن کے گھر پر حملہ کیا، اُس حملہ میں یہ قتل ہو گئے، ڈاکوؤں نے اُن کو پیش کش کی تھی کہ اگر یہ اسلام کی جانب پلٹ آئیں تو اُن کو چھوڑا جا سکتا ہے مگر ڈاکٹر مہر مسیحیت پر قائم رہنے کا عزم کرتا رہا، نتیجتاً ان کو قتل کر دیا گیا۔[۱] اُن کی پیشہ ورانہ خدمات اور مشنری سرگرمیوں میں بھرپور شرکت کے پیش نظر مسیحی حلقوں میں اُن کا بڑا احترام پایا جاتا ہے۔

عظیم عامر نے "عصر حاضر کا داؤد" تحریر کی، یہ پادری امام دین شہباز (م۱۹۱۸ء) سے متعلق سوانح عمری ہے۔ امام دین شہباز حیات بعد الممات کے بارے میں تشکیک کا شکار ہوا اور اسلام چھوڑ کر مسیحی ہو گیا، اس نے مسلم صوفیاء پر بھی اعتراضات کئے۔[۲] قُبولِ مسیحیت کے نتیجے میں امام دین کو اپنے خاندانی اور سماجی روابط سے دست بردار ہونا پڑا، اُس نے سلسلۂ تعلیم کو جاری رکھا اور امریکہ کی ایک یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری حاصل کی۔ بعد ازاں ایک مسیحی خاتون جس کا نام مریم تھا، سے شادی ہو گئی، ۱۸۸۲ء میں سکاچ مشن کے صدر سکول میں مدرس کی حیثیت سے تعیناتی ہوئی اور جغرافیہ، اردو اور حساب پڑھانے میں زندگی گزری۔ امام دین نے امرتسر اور انبالہ میں بھی تدریس کے فرائض انجام دیئے، وہ قادر الکلام شاعر تھا اور تخلص شہباز تھا، اردو اور فارسی میں شعر کہا کرتے تھے۔ امام دین نے زبور کا پنجابی میں منظوم ترجمہ بھی کیا۔ اور پسرور، سیالکوٹ اور بھلوال میں مسیحیت کی تبلیغی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا۔ ۱۹۲۱ء میں امام دین کی وفات ہوئی، اور بھلوال کے مسیحی قبرستان میں دفن کیا گیا۔[۳]

نو مسیحیوں کی آپ بیتیوں اور سوانح عمریوں میں ایک اہم فرق یہ ہے کہ آپ بیتیوں میں اسلام سے متعلق سخت و تلخ لب و لہجہ استعمال کیا گیا ہے، اس کے برعکس سوانح عمریوں کے زیادہ تر مباحث کا تعلق قُبولِ مسیحیت کے بعد کی مشنری خدمات سے ہے۔ بہر حال یہ سارا متعصُّبانہ مواد حقائق سے توجہ ہٹانے کے لیے تشکیل دیا گیا۔ مقامی اور غیر ملکی مصنفین کی اَن گنت کُتبِ تاریخ اور رسائل و جرائد کے مضامین اس حقیقت کے گواہ ہیں کہ برصغیر میں برطانوی سامراج کا طرزِ حکومت اسلام اور مسلمانوں سے دشمنی پر عبارت تھا۔ مسلمانوں کو مسیحیت قبول کرنے کے لئے مالی و سیاسی اور سماجی ترغیبات دی جارہی تھیں۔ دُنیاوی مفادات کے حُصول کے لئے بعض کمزور ایمان کے حامل مسلمانوں نے ترکِ اسلام کر کے مسیحیت کو قُبول کر لیا۔ ان آپ بیتیوں اور سوانح عمریوں میں اسلام پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں مولانا رحمت اللہ

---

(۱) اصغر فضل الٰہی پال، پادری، خادم حق، ص:۱-۹۳

(۲) عظیم عامر، عصر حاضر کا داؤد، مکتبہ عناویم پاکستان، گوجرانوالہ، ۲۰۰۵ء، ص:۱-۱۱۲

(۳) ایضا، ص:۲۷-۱۱۲

کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ ایسے مسلم علماء اُن کا مُسکت جواب بخوبی دے چکے تھے۔ اس پسِ منظر میں یہ سارا مذہبی ادب جھوٹ، بلاجواز الزام تراشی اور سیاسی و مذہبی پروپیگنڈے کا پلندہ ہس ہے۔

خلاصہ بحث

مقالہ ہذا برصغیر کے نو مسیحی مصنفین کے انتقادی مطالعہ اسلام کے ایک مخصوص پہلو سے متعلق ہے۔ اس میں پیش کردہ تمام گزارشات کے خلاصے کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ اسلام ترک کر کے مسیحیت کو قُبول کرنے والے حضرات کی آپ بیتیاں اور سوانح عمریاں کثیر الجہتی اہمیت کی حامل ہیں۔ برصغیر کی مذہبی اور علمی و فکری میراث سے متعلق یہ حسّاس اور بے مثال مواد نو مسیحی مصنفین کے خاندانی احوال، ذاتی کوائف، داخلی و خارجی کیفیات، مشاہدات و تجربات، احساسات و جذبات، ذہنی رُجحانات، دلچسپیوں اور عقائد و نظریات کے بارے میں اہم معلومات فراہم کرتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ مذہبی مواد اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اشکالات، اعتراضات اور الزامات کی حقیقت جاننے کا ایک قابلِ اعتبار اور مؤثر ذریعہ بھی ہے۔ اس تاریخی اور علمی ذخیرہ سے ابہامات کے خاتمے میں مدد لی جاسکتی ہے۔ اس مخصوص مذہبی، تاریخی اور اعتقادی پسِ منظر میں اس سوانحی مواد کا جائزہ نہایت ضروری ہے۔ اسلامی عقائد و روایات کی تفہیم اور اُن کے دفاع کی بہت سی راہیں اِس مواد کے مطالعہ سے دریافت ہو سکتی ہیں۔ یہ آپ بیتیاں اور سوانح عمریاں اسلام کے خلاف لکھے گئے مسیحی ادب کا ایک اہم اور منفرد حصہ ہیں۔ یہ ادب تعصُّب، نفرت اور اشتعال کے فروغ کا باعث بنا۔ اس میں شوخیٔ تحریر، بے لگام منطق اور انسانی نفسیات و جذبات کا سہارا لے کر قرآن، حدیث، سیرتِ طیبہ، فقہ، تصوف، خلافتِ راشدہ، اسلامی ریاست، مسلم فکر اور اس کے متعلقات پر اعتراضات کئے گئے۔ برصغیر کے مخصوص نو آبادیاتی پسِ منظر اور اُس کے اثرات کی تفہیم کے لئے ضروری ہے کہ ان آپ بیتیوں اور سوانح عمریوں پر گہرا غور و خوض کیا جائے، تحقیق و تجزیہ کے اعلیٰ معیارات کے ذریعے حقیقت کی وضاحت کی جائے، اِن تحریرات کے تناظر میں برصغیر کے مختلف تاریخی ادوار کا جائزہ لیا جائے اور دیکھا جائے کہ مسیحیت کی آمد اس علاقہ میں کس طرح ہوئی، قُبولِ مسیحیت کے مختلف مراحل برصغیر میں کیا ہیں، مسیحیوں کے تبشیری نظام کے خدّوخال کو سمجھا جائے، مسیحیت کی اشاعت اور اس کی رفتار کا تجزیہ کیا جائے، نو مسیحی مصنفین کے حسب نسب کا جائزہ لیا جائے، اُن کے احوال و آثار کے مطالعہ سے قُبولِ مسیحیت کے اصل محرکات کا تعین کیا جائے، غور کیا جائے کہ مسلمان کی حیثیت سے اُن کا علمی رُتبہ کیا تھا، اُن کی سیاسی و سماجی حیثیت کیا تھی، اُن کے اُسلوبِ تحریر پر تنقیدی نگاہ ڈالی جائے، اُن کے اعتراضات کا غیر جانب دارانہ مطالعہ کیا جائے، نُصوص و عقائدِ اسلامیہ پر ہونے والے اعتراضات کی حقیقت اور اُن کا پسِ منظر سمجھا جائے، یہ تمام مطالعات و تجزیات مسلمانوں کے علمی و فکری حلقوں کے لئے نہایت ضروری اور مفید ہیں خصوصاً تقابلی مطالعات اور تاریخِ مذاہب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے ہمہ جہتی اہمیت کے حامل ہیں۔

سفارشات

۱. ان آپ بیتیوں اور سوانح عمریوں میں موجود اشکالات کی وضاحت کے لئے مسلم علماء نے تصانیف و تالیفات ترتیب دیں، رسائل لکھے، اخبارات میں مضامین تحریر کئے اور مباحثوں کی رودادوں کو مرتب کیا، یہ دفاع اسلام کا مواد کُتب خانوں کی بند الماریوں کی زینت بنا بیٹھا ہے اور اسے دیمک چاٹ رہی ہے، اس تاریخی علمی سرمائے کا تحفظ کیا جائے، زیادہ مناسب ہے کہ اس کی اشاعتِ نو کا اہتمام کیا جائے۔

۲. اس مخصوص مذہبی ادب کا ایک اہم مقصد اسلام اور مسلمانوں سے متعلق غلط فہمیاں پیدا کرنا تھا۔ ان غلط فہمیوں کے ازالہ کے لئے عام فہم انداز میں اسلام کا دفاعی ادب تشکیل دے کر اس کی اشاعت کی جائے۔

۳. نو مسیحیوں کے بیانات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی تعلیمات کی برکات کو علماء و محققین کی طرف سے برصغیر میں پوری طرح بیان نہیں کیا گیا، ضرورت اس امر کی ہے کہ محاسنِ اسلام کی وضاحت پر مشتمل کُتب کو شائع کیا جائے۔

۴. مغربی دُنیا خصوصاً برطانیہ میں اٹھارویں صدی عیسوی کے بعد ظاہری طور پر مذہب و سیاست کا باہمی رشتہ بڑی حد تک کمزور ہو چکا تھا، اس تاریخی حقیقت کے باوُجود انگریز نے برصغیر میں سیاسی استحکام کے لئے مذہب کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا، مسیحی حکمرانوں کے اس سیاسی رویّے کے اسباب و محرکات کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔

۵. نو مسیحیوں کی آپ بیتیوں اور سوانح عمریوں کے تناظر میں تاریخ و سیاست اور عقائد و روایات کے مختلف پہلوؤں پر جامعات میں تحقیقات کرائی جائیں۔

۶. فروغِ مسیحیت اور اس کے ذرائع کے علاوہ اسلام پر نقد و نظر کے مختلف اسالیب سے متعلق تحقیق و تجزیہ کو آگے بڑھایا جائے۔

۷. مسیحیت کے لئے کام کرنے والے مختلف اداروں اور تنظیموں کی سرگرمیوں پر خصوصی نظر رکھی جائے، اُن کے ظاہری مقاصد تو شاید مسلم معاشروں میں قابلِ قُبول ہوں مگر اصل اہداف کے اعتبار سے وہ ادارے ناقابلِ برداشت ہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ برصغیر میں ترکِ اسلام کے بعد قُبول مسیحیت کے رُجحان کو ان اداروں اور خفیہ تنظیموں نے ہی معاشی و مادی وسائل فراہم کیے۔

۸. نو مسیحیوں کے بعض اعتراضات عقلی و فطری معیار پر پورے نہیں اُترتے، اس ضمن میں ضروری ہے کہ مسیحی مصنفین کے افکار کے عقلی و منطقی تجزیات کو فروغ دیا جائے۔

۹. اس سوانحی ادب کی صورت میں مذہب کی بہت سی کلامی جہتیں منظرِ عام پر آئی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان جہتوں سے استفادہ کیا جائے اور ان پر تحقیقات کی فکر کی جائے۔

۱۰. اس مذہبی ادب کا ایک اہم پسِ منظر مغربی استعمار کا طرزِ سیاست ہے، برصغیر میں استعمار نے مذہب کو مقاصدِ مخصوصہ کی تکمیل کے لئے ایک ہتھیار اور آلہ کے طور پر استعمال کیا ہے، اس سامراجی نفسیات کے تجزیہ کے لیے اعلیٰ سطحی تحقیقات کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔

۱۱. آپ بیتیاں اور سوانح عمریاں مرتب کرنے والے پادریوں کے معاشی وسائل پر تحقیقات کی ضرورت ہے تاکہ تبشیر اور سامراج کے تعلق کی تفہیم ہو سکے۔

۱۲. بہت سی آپ بیتیوں میں مصنفین کی مذہب بیزاری اور دیگر نفسیاتی مسائل کے بارے میں معلومات ملتی ہیں، بعض کی ابتدائی زندگی مسلمان ہونے کے باوُجود اسلام کی روح سے مطابقت نہیں رکھتی تھی اور بعض عائلی و نجی پیچیدگیوں کا شکار تھے، اس پسِ منظر میں اس مذہبی مواد کے نفسیاتی تجزیہ کی ضرورت ہے۔

۱۳. بعض نو مسیحی مصنفین نے اپنے صوفیانہ تجربات کی ناکامی کو اپنی آپ بیتیوں میں تحریر کیا ہے، اس ناکامی کا اصل سبب یہ ہے کہ یہ لوگ تصوف سے متعلق راست رو اسلامی فکر سے لاعلم ہی نہیں بلکہ صوفیا کی صحبتوں کی حلاوت وچاشنی سے بھی ناآشنا تھے، اس پسِ منظر میں دینی مدارس اور عصری علوم سے متعلق جامعات میں تصوف کے مختلف تصورات کی تفہیم کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں تحقیقات کو فروغ دے کر افکارِ تصوف کی اصلاح و تنقیح کی راہ ہموار کی جاسکتی ہے۔

۱۴. محاسنِ اسلام سے متاثر ہو کر جن مسیحیوں نے اسلام کو قُبول کیا اُن کے احوال وآثار کی جمع وتدوین کی جائے ، تاکہ نو مسیحیوں کی آپ بیتیوں اور سوانح عمریوں کے منفی اثرات کے خاتمے کے لیے مسلمانوں کا جوابی بیانیہ تشکیل دیا جاسکے۔

❁❁❁

التأصيل القرآني لبعض مصطلحات المحدّثين

The Origion of Muḥaddithīn's Terminologies in The Qur'ānic Context

فضل الرحمن محمود*
د. مسعود أحمد**

ABSTRACT

It is the greatest blessing of Allah Almighty, that a person acquires the knowledge of Ḥadīth and its sciences. Ḥadīth is the heritage of the Last Prophet of Allah Almighty. Muslim Scholar have strived to serve the Holy Qur'ān and Sunnah and have been keen to preserve Prophetic traditions from fabrication. Among the sciences that guard the prophetic traditions is "Ulūm ul Ḥadīth". Not long but voice are being raised on the legality of the sacred knowledge that it stands baseless. Keeping in view the said situation, I aim to throw light on the staunch and steadfast bases that this knowledge lies upon from the Holy Qur'ān and encounter the suspicions created by the enemies and refute them in a radical and critical manner.

The object of research is dispersed in the books so requires compilation and composition that never is an easy task and we see that the scholars and researchers have mentioned the terminologies of the knowledg, defined them but have never really looked to mention their basis from the holy scriptures so in this research it is tried to link the basis of the founded rules from the Holy book.

Keywords: *Evedence, Deduce, Qur'ān, Terminolgy, Ilm e Hadīth*.

* طالب الدكتوراه، كلية أصول الدين،قسم الحديث،الجامعة الإسلامية العالمية،إسلام آباد،باكستان
** أستاذ مساعد، كلية أصول الدين،قسم الحديث،الجامعة الإسلامية العالمية،إسلام آباد،باكستان

الحمد لله رب العلمين، والصلاة والسلام على رسوله الأمين، وعلى صحابته، ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين أما بعد؛

فإن أولى ما تُصرف فيه نفائس الأيام، وأعلى ما يهتم به الإنسان، الاشتغالُ بالحديث والقرآن ، وهما عمدتان في العلوم الشرعية. وباقي العلوم آلات وأدوات يستعان بها على فهم كلام الله تعالى، وسنة النبي المصطفى ﷺ. ومن هذه الآلات التي تعين على فهم كلام الله تعالى وسنة نبينا المصطفى علمُ "أصول الحديث" أو"علوم الحديث"، الذي يذبّ عن حديث الرسول صلى الله عليه وسلم الكذب والتزوير، والدس والتغيير، ويميّز بين الصحيح والسقيم، والغث والسمين.

وقد وضع العلماء المحدّثون والأئمة النقاد قواعد ومصطلحات لهذا العلم الجليل ليحفظوا به السنة النبوية من الباطل. ولم يقتصروا على تدوين مبادئه، وذكر أنواعه، وأصوله، وتعريفاته، وتوضيح معالمه وحدوده فحسب؛ بل ذكروا أن أدلة هذا العلم توجد في النصوص الشرعية. وهذا البحث محاولة لاستخراج مثل هذه الأدلة من النصوص، واستنباطِها من مظانها ومصادرها التي تستمد منها قواعد ومصطلحات هذا العلم. وهناك عديد من الأسباب التي جعلتني أن أجمع في هذا الفن ما يغلي الغليل ويفي مراد القاصدين لهذا العلم الشريف.

وألخص تلك الأسباب في النقاط التالية:

أولاً: أن مباحث هذا الموضوع متناثرة في بطون الكتب، وتحتاج إلى جمع وتأليف، ولا يخفى على كل من له عناية بالعلم جمعًا، ودراسةً، واستنباطًا، وتحريرًا، أن هذا الأمر كم يحتاج من عناية فائقة مع المعاناة، والنصب، وبذل الجهد.

ثانيا: اقتصر الباحثون والمؤلفون في "علم الحديث" على ذكر أنواعه، وبيان تعريفاته وحدوده فحسب، ولعله عمل أرادوه للتبصر والتعرف على أنواعه دون التعرض لذكر أدلة الأنواع لما كان هذا الجيل يتمتع بإستحضار الأدلة من القرآن والسنة، فلذا لم يتطرق أغلب من ألّف في هذا الفن الشريف أن يذكر أدلة هذه المصطلحات من الكتاب والسنة مع أن أدلة هذه المصطلحات متوافرة في بطون أمهات الكتب الشرعية، استنبطها العلماء منها، وأعملوا عقولهم في تنظيمها وترتيبها، فهذا البحث محاولة لاستخراج أدلة هذه الأصول من مظانها، وذكر مصادرها التي استمدت منها "قواعد ومصطلحات علوم الحديث" إن شاء الله تعالى.

وسبقني في الموضوع الأستاذ زهير عثمان علي نور في مقاله المسمى بـ"أدلة علم مصطلح الحديث، والدكتور شعبان عبدالله في كتابه الماتع "التأصيل الشرعي لقواعد المحدثين"، ولكن جلّ عنايتهما بالأحاديث والآثار، ولم يعتنيا بالآيات القرآنية كما ينبغي، فاخترت هذا العنوان لعل الله يرزقني التوفيق لسدّ هذا الخلل.

وقد اتبعت في البحث "المنهج الإستقرائي الإستدلالي" حيث أذكر القواعد والمصطلحات الحديثية ثم سآتي بالآيات القرآنية الدالة على هذه القواعد والمصطلحات، إن شاء الله تعالى.

وقد قسمت هذا البحث إلى مبحثين:

المبحث الأول: تقسيم الحديث بإعتبارتعدد طرق الوصول إلينا وتأصيلها القرآني.

المبحث الثاني: تقسيم الحديث من حيث القبول والرد وتأصيله القرآني.

المبحث الأول: تقسيم الحديث باعتبار تعدد طرق الوصول إلينا وتأصيلها القرآني.

قسم المحدّثون الخبر من حيث عدد رواته إلى خبر متواتر، وخبر آحاد[١]. ثم خبر الآحاد الذي يشمل على ثلاثة أنواع: المشهور والعزيز والغريب، وهذا المبحث يشتمل على ذكر هذه الأنواع والتأصيل لها من القرآن الكريم.

المتواتر

المواترة لغةً المتابعةُ.[٢] وفي الاصطلاح هو:ما رواه عدد كثير أحالت العادة توافقهم على الكذب، وهو مفيد للقطع واليقين عند المحدثين.

التأصيل القرآني للخبر المتواتر

يمكن أن يستدل له بمايأتي:

١: ﴿فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ﴾[٣][٤]

"الطائفة" في اللغة: تدل على واحد، واثنين، والجماعة، ويدل على استعمالها في معنى "الجماعة" سياقُ قوله تعالى: ﴿وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾، وقولُه تعالى:﴿لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ﴾؛ لأن ضمير الجمع فيه يرجع إلى "الطائفة"؛[٥] فدلت الآية على أن الجماعة إذا روت خبرا، يجب قبوله، وهذا النوع من الرواية التي يرويها جمع من الرواة يُسمّى عند المحدثين بالمشهور أو المتواتر.

---

(١) الخطيب البغدادي،أحمد بن علي بن ثابت،الكفاية في علم الرواية،تحقيق:أبو عبدالله السورقي وإبراهيم حمدي المدني، المكتبة العلمية،المدينة المنورة،ص:١٦

(٢) الفارابي،إسماعيل بن حماد،الصحاح تاج اللغة وصحاح العربية،تحقيق: أحمد عبد الغفور عطار،دار العلم للملايين، بيروت،الطبعة الرابعة:١٩٨٧م،٢/ ٨٤٣

(٤) سورة التوبة،الآية:١٢٢

(٥) ابن العربي،مُحَمَّد بن عبد الله أبو بكر،أحكام القرآن،تحقيق:مُحَمَّد عبد القادر عطا،دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الثالثة:٢٠٠٣م،٢/ ٦٠٣

قال العلامة الآلوسي رحمه الله في تفسير هذه الآية: إن الإستدلال بالآية لايتوقف على أن كلمة "الطائفة" تصدق على الواحد فقط؛ بل تصدق على ما بلغت حد التواتر.(١)

وقال المفتي جميل أحمد التهانوي رحمه الله في كتابه (أحكام القرآن):"لانقول: إن الآية مقتصرة للدلالة على خبر الواحد، بل تدل عليه، وعلى المشهور والمتواتر أيضا".(٢)

٢: الحديث المتواتر يفيد العلم اليقيني كما ذكرناه سابقا، وقد نبّه الله تعالى في غير موضع من القرآن الكريم أن التواتر يفيد علم اليقين كالرؤية البصرية، حيث خاطب رسوله ﷺ أو المؤمنين أو غيرهم بأمثال قوله:﴿ أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ﴾(٣) وقوله:﴿أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ﴾(٤) وقوله:﴿ أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ قَرْنٍ﴾(٥) إلخ. فإن هذه الأحداث كانت شائعة فيهم، ومعلومة عندهم بالتواتر، فبيّن الله تعالى بكلمات "ألم يروا" وأمثاله: أن العلم بهذه الأحداث كالرؤية البصرية لها، وأشار أن العلم الذي يحصل من التواتر، هو بمنزلة المعاينة والمشاهدة في القطع واليقين.(٦)

المشهور

هو من الشهرة، ويدل على وضوح في الأمر.(٧) واصطلاحاً هو:ما رواه ثلاثة فأكثر ولم يبلغ رتبة التواتر.(٨)

التأصيل القرآني لذلك

ويُستدل لهذا النوع بما ورد في القرآن الكريم عن أصحاب القرية:

---

(١) الآلوسي،محمود بن عبد الله،روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني،تحقيق:علي عبد الباري عطية،دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولى:١٤١٥هـ،٦/ ٤٦

(٢) التهانوي،جميل أحمد،أحكام القرآن،الجزء الأول من الحزب الثالث،إدارة أشرف التحقيق والبحوث الإسلامية، لاهور،الطبعة الأولى:١٤١٩هـ،ص:٢٠٤

(٣) سورةالفيل:الآية:١

(٤) سورة الفجر،الآية:٦

(٥) سورة الأنعام،الآية:٦

(٦) العثماني،شبير أحمد،موسوعة فتح الملهم بشرح صحيح الإمام مسلم،تحقيق:نور البشر بن نورالحق ومحمود شاكر،دار إحياء التراث العربي،بيروت،لبنان،الطبعة الأولى:٢٠٠٦م،١/١٦

(٧) الرازي،أحمد بن فارس زكريا،معجم مقاييس اللغة،تحقيق:عبد السلام مُحَمَّد هارون،دار الفكر،١٩٧٩م،٣/ ٢٢٢

(٨) ابن حجر العسقلاني،نزهة النظر،دار المعرفة،الطبعة الثالثة:٢٠٠٦،ص:٤٦، والسيوطي،عبد الرحمن بن أبي بكر، تدريب الراوي في شرح تقريب النواوي،تحقيق:أبو قتيبة نظر مُحَمَّد الفاريابي،دار طيبة،١٩٩٨،٢/ ٦٢١

﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا أَصْحَابَ الْقَرْيَةِ إِذْ جَاءَهَا الْمُرْسَلُونَ، إِذْ أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوا إِنَّا إِلَيْكُمْ مُرْسَلُونَ﴾(١)

المراد بكلمة "المرسلون" في الآية هم رسل عيسى عليه السلام الذين أرسلهم إلى أهل إنطاكية؛ ليدعوهم إلى الحق المبين، ويبيّنو لهم أن ما يعبدونه من الأوثان والأصنام لاينفعونهم شيئا، فبعث إليهم أولاً رسولين، فلمّا كذّبهما أهل إنطاكية، قوّاهما بثالث؛(٢) لتتم إقامة الحجة عليهم؛ ولأن العقل الإنساني لايكذِّب عادةً الخبرَ الذي رواه ثلاثة من ثقات عدول.(٣)

العزيز

العزة لغةً: تدل على الشدة، والقوة، والغلبة. ويأتي أيضا بمعنى القلة، والندرة.(٤)

واصطلاحا هو: أن لا يرويه أقل من اثنين عن اثنين، وسمّي به لكون هذا النوع قليل الوجود في الحديث النبوي.(٥)

التأصيل القرآني لذلك

ممايؤصل به لهذا النوع قولُه تعالى:﴿وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِنْكُمْ﴾(٦)

أمرنا الله تعالى في هذه الآية بإقامة شهادة "ذَوَي عدل" في الحقوق والمعاملات كلها، فاقتضى ذلك أن العمل برواية "عدلين" واجب، ولا يجوز التجاحد عنها؛ وإلا لم نؤمر بذلك. ولايقال: إن الآية جاءت في "الشهادة" لا في "الرواية"؛ لأن كل شهادة خبر.(٧)

وقولُه تعالى:﴿وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ﴾(٨)

---

(١) سورة يس،الآية:١٤

(٢) الزمخشري،محمود بن عمرو،الكشاف عن حقائق غوامض التنزيل،دار الكتاب العربي،بيروت،الطبعة الثالثة:١٤٠٧هـ، ٤/٧-٨

(٣) القاسمي،محمّد طيب،حديث رسول كا قرآني معيار،إدارة إسلاميات،لاهور،١٩٧٧م،ص:٥٤

(٤) الفارابي، الصحاح:٣/ ٨٨٥،والرازي،معجم مقاييس اللغة،٤/ ٣٨-٣٩

(٥) ابن حجر العسقلاني،نزهة النظر،ص:٤٧

(٦) سورةالطلاق،الآية:٢

(٧) طيب القاسمي،حديث رسول كا قرآني معيار،ص:٥٦،والجصاص،أحمد بن علي،أحكام القرآن،تحقيق:محمّد صادق القمحاوي،دار إحياء التراث العربي،بيروت،١٤٠٥هـ،٣/٥٣٠

(٨) سورة البقرة،الآية:٢٨٢

أمر الله المؤمنين في هذه الآية أن يطلبوا شهادة رجلين عند معاملتهم بالدَّين إلى أجلٍ معلوم، وفائدة هذه الشهادة حفظ المال؛ لأن الإنسان ينسى ويتأخر في المطالبة، والمديون يتجاحد ولايقر بأنه أخذ المال، فصارت الشهادة سببا لحماية المال من الضياع، وحفظه من الجانبين[١].

والأمر بطلب شهاد رجلين على الدَّين يشير إلى أنه يجب قبول خبرٍ يرويه اثنان من الثقاة العدول؛ وإلا لم يكن للأمر معنى ولافائدة.

المؤزَّر

ويسمى "العزيز" عند المحدّثين بـ"المؤزَّر" أيضا، وهو من التأزير بمعنى التقوية[٢]، ويشيرون بذلك أن الرواية قويت بمجيء طريق أخرى، وليتهم سمّوه بذلك لقوله تعالى:﴿وَاجْعَلْ لِي وَزِيرًا مِنْ أَهْلِي، هَارُونَ أَخِي، اشْدُدْ بِهِ أَزْرِي﴾[٣]

أخذوه من قوله: "أزري" وهو القوة، يقال: آزُره، أي: قوّيتُه وعاونتُه[٤].

وأيضا تدلّ هذه الآية على أن الخبر الذي رواه اثنان، له أثر خاص في القلوب، وأصلح للقبول؛ لأن الله تعالى لما أمر نبيَّه موسى عليه السلام أن يذهب إلى فرعون، ويدعوه إلى الله، سأله أن يجعل أخاه "هارون" وزيرا له؛ لأنه عرَف أن معاونة الرجل أخاه في الدِّين مع إخلاص النية والمحبة، له مزية خاصة في الدعوة إلى الله تعالى؛ ولذلك قال سيدنا عيسى عليه السلام:﴿قَالَ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ آمَنَّا بِاللَّهِ وَاشْهَدْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ﴾.[٥]

الغريب

الغِرب هو: أن يتنحى الرجل عن الناس.[٦] وفي اصطلاح المحدّثين هو: ما انفرد بروايته راو واحد في أي موضع وقع هذا الإنفراد من السند.[٧]

---

(١) الرازي،مُحَمَّد بن عمر فخر الدين،التفسير الكبير،دار إحياء التراث العربي،بيروت،الطبعة الثالثة: ١٤٢٠ هـ،٩٢/٧

(٢) الفيروز آبادي،القاموس المحيط،دار الحديث القاهرة،الطبعة الرابعة:٢٠٠٧،٣٤٣/١

(٣) سورة طه،الآية:٢٩-٣١،وانظر:شبير أحمد العثماني،موسوعة فتح الملهم،١٩/١

(٤) ابن منظور الإفريقي،لسان العرب،دار صادر،بيروت،الطبعة الثالثة:١٤١٤هـ،١٧/٤

(٥) سورة آل عمران،الآية:٥٢،وانظر:الرازي،التفسير الكبير،٤٤/٢٢

(٦) ابن منظور الإفريقي،لسان العرب،١/ ٦٣٨،والفيروز آبادي،القاموس المحيط،ص:١١٩

(٧) ابن حجر العسقلاني،نزهة النظر،ص:٥٠

التأصيل القرآني لذلك

للتأصيل لهذ النوع عشرات الآيات في القرآن الكريم، قال الإمام أبو الحسن البزدوي رحمه الله: إن الآيات في حجية خبر الغريب أو خبر الواحد أكثر من أن يعد ويحصى.(١) نذكر منها آيتين على سبيل المثال:

١: قال تعالى:﴿وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُونَهُ فَنَبَذُوهُ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُونَ.﴾(٢)

أخبرنا الله في هذه الآية أنه أخذ الميثاق من أهل الكتاب وأمرهم بأن يبينوا للناس ما عندهم من العلم، وهذا الأمر كان منه بأنه يستطيع كل واحد منهم أن يذهب إلى قوم ويبين لهم، ولايكتم عنهم شيئا؛ لأن الله تعالى لايكلّف عباده إلا بما يطيقون، وليس في طاقاتهم أن يجتمعوا، ويذهبوا إلى كل واحد من الدنيا في الشرق والغرب ويبينوا لهم أمور الدين، فاستقر الأمر على أنه يجب على كل واحد منهم أن يبلّغ ما يحمله من العلم.(٣)

٢: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَى مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ﴾(٤)

في هذه الآية وعيد عظيم لكل من يكتم ما عنده من العلم والخير ولايُظهره للناس بأنه يستحق اللعن من الله والبُعد عن رحمته (٥)؛ فيجب على كل من يتلقى عن الرسول ﷺ شيئاً من الدين أن يظهره ولايكفّ عن بثّه، ويجب علينا قبوله.(٦) يقول الإمام الرازي رحمه الله في تفسير هذه الآية:"إن كل ما يتعلق بالدّين لايجوز أن يكتمه الإنسان من عباد الله تعالى، بل يسعى في نشره، ويبلّغه إلى كل من يحتاج إليه من المكلفين، ويأثم إن كتمه من الناس، ومثل هذه الآية قوله جلّ وعلا:﴿وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلا تَكْتُمُونَهُ﴾.(٧) وقوله تعالى:﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتابِ

---

(١) البخاري،علاء الدين،عبد العزيز بن أحمد،كشف الأسرار شرح أصول البزدوي،دار الكتاب الإسلامي، بدون ذكر الطبعة وتاريخ النشر،٣٧٢/٢

(٢) سورة آل عمران،الآية:١٨٧

(٣) علاء الدين البخاري،كشف الأسرار،٢/ ٣٧١

(٤) سورةالبقرة،الآية:١٥٩

(٥) المحلي،جلال الدين،مُحَمَّد بن أحمد والسيوطي،جلال الدين،عبد الرحمن بن أبي بكر،تفسير الجلالين،دار الحديث،القاهرة، الطبعةالأولى، بدون ذكر تاريخ النشر،ص:٣٢

(٦) علاء الدين البخاري،كشف الأسرار،٣٧٢/٢

(٧) سورة آل عمران،الآية: ١٨٧

وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَناً قَلِيلًا﴾[١] فتدلّ هذه الآيات كلها على أن إظهار العلم الديني، وإنذار الناس واجب على كل مسلم"[٢].

المبحث الثاني: تقسيم الحديث من حيث القبول والرد

اتصال السند

لاتخفى أهمية اتصال السند عند من له أدنى إلمام بعلوم الحديث وأصوله. قد بالغ الأئمة في استيفاء هذا الشرط، وميّزوا بأقصى جهودهم ماكان صحيح الاتصال مما فيه الانقطاع مع سائر ألوانه ومختلف صوره وأنواعه، حتى تجدهم يستحلفون بعض الرواة على سماعهم، كما استحلف شعبة عبدَ الله بن دينار على سماع الحديث من ابن عمر رضي الله عنهما.[٣]

الإتصال لغةً واصطلاحاً

الإتصال هو: انضمام الشيء إلى الشيء.[٤]وفي اصطلاح المحدّثين هو:رواية كل راو عمن فوقه مباشرة في كل طبقات السند، من غير سقط، سواء كان هذا السقط عمداً أو من غير عمد، من أول السند أو من آخره أو من أثنائه، سقوطا ظاهرًا أو خفيًا.[٥]

التأصيل القرآني لذلك

يستدل لشرط الاتصال بقوله تعالى: ﴿لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ﴾[٦] يدلّ قوله تعالى:﴿إِذَارَجَعُوا إِلَيْهِمْ﴾ على ضرورة اتصال السند، وأن الحديث المنقطع مع أنواعه من الإرسال، والإعضال، والتدليس، والتعليق ضعيفٌ لاتقوم به حجة، وإليه أشار الحاكم في كتابه

---

(١) سورةالبقرة،الآية:١٧٤

(٢) الرازي،التفسير الكبير،٤/١٤٠

(٣) الرازي،عبد الرحمن بن أبي حاتم،الجرح والتعديل،مجلس دائرة المعارف العثمانية،حيدر آباد،الدكن،الهند،دار إحياء التراث العربي،بيروت،الطبعة الأولى:١٩٥٢م،١/ ١٧٠

(٤) ابن منظور الإفريقي،لسان العرب،١١/ ٧٢٦،وابن فارس،معجم مقاييس اللغة،٦/١١٥

(٥) فاتح بوزيت،مسالك الكشف عن الاتصال والانقطاع في الرواية عند المحدثين النقاد،رسالة الماجستير،الجامعة الأردنية،٢٠٠٦م،ص:٢٣

(٦) سورة التوبة،الآية:١٢٢

"معرفة علوم الحديث"، أن هذا النص يدل على أن الخبر الذي يصح أن يحتج به هو ما سمعه الراوي من شيخه وثبت لقاؤه به، ولايكون فيه انقطاع ولا إرسال.(١)

مراسيل الصحابة،هل لها حكم الاتصال أم لا؟ والتأصيل القرآني لها

تبيّن مما تقدّم أن العلم المحتج به هو ماثبت في إسناده الإتصال من أوّله إلى منتهاه، وأن الإنقطاع يؤدّي إلى ردّ الحديث وعدم القبول به، سواء كان الإنقطاع في موضع واحد أو أكثر، على جهة التوالي أو لا؛ ولكنّ مرسل الصحابة مقبولٌ بإجماع الأئمة والنقّاد المحدّثين، كماسنبيّنه فيمايلي:

مرسل الصحابي

هو ما يرويه الصحابي عن النبي ﷺ، ولم يسمع منه، إما لكونه صغير السن، أو متأخر الإسلام، أو غاب عن أن يشهد ذلك.(٢)

حكم مرسل الصحابي

مرسل الصحابي حجة عند أهل الشأن لكونه عدلاً مرضيّاً عند الله تعالى، فحكمه حكم الموصول المسند، بل إن المحدّثين لم يعدّوه من المرسل. وهذا مثل ما رواه ابن عباس رضي الله عنهما عن النبي ﷺ ولم يسمعه منه، لأن روايته عن الصحابة. وجهالة الصحابة لاتضر ، لأن الله تعالى ورسوله نصّ على عدالتهم.(٣)

التأصيل القرآني لذلك

الآيات الدّالة على عدالة الصحابة كثيرة، منها قوله تعالى:﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُم أُمَّةً وَسَطًا﴾(٤)

استدل العلماء بهذه الآية على عدالة الصحابة، بأنّ "وسطا" بمعنى"عدلا" (٥)

وذكر الخطيب البغدادي: إن هذه الكلمة عام ولكن أريد به الخاص، وقال بعض العلماء:إن هذه الآية وردت في الصحابة خاصة دون غيرهم.(٦)

---

(١) الحاكم النيسابوري،مُحَمَّد بن عبدالله،معرفة علوم الحديث،تحقيق:السيد معظم حسين،دار الكتب العلمية،بيروت، الطبعة الثانية:١٩٧٧م،ص:٢٦

(٢) نور الدين عتر،منهج النقد في علوم الحديث،دار الفكر،دمشق،سورية،الطبعة الثالثة:١٩٨١م،ص:٣٧٣

(٣) ابن الصلاح، عثمان بن عبد الرحمن،مقدمة ابن الصلاح،تحقيق:نور الدين عتر،دار الفكر،سوريا،دارالفكر المعاصر، بيروت،١٩٨٦م،ص:٥٦

(٤) سورةالبقرة،الآية:١٤٨

(٥) ابن كثير،إسماعيل بن عمر،تفسير القرآن العظيم،تحقيق:سامي بن مُحَمَّد سلامة،دار طيبة للنشر والتوزيع،الطبعة الثانية:١٩٩٩م،١/٤٥٥

(٦) الخطيب البغدادي، الكفاية في علم الرواية،ص:٤٦

العدالة وما يتعلق بها من القواعد

العدالة صفةٌ في الراوي تؤهّله لرواية الحديث، يصون بها الأئمة من النقاد حديثَ النبي المصطفى عليه الصلاة والتسليم عن الدسّ، والتغيير، والتبديل ممن غلب عليه هواه، أو نقص حفظُه، لما فيه النصح للشريعة الإسلامية، كما أخرج مسلم في صحيحه قولَه ﷺ: "الدين النصيحة".(١)

العدالة لغة واصطلاحا

العدل والعدالة لغةً: الإستقامة والحكم بالحق، وهو ضد الجور.(٢) وفي الإصطلاح هي: ملكة تحمل على ملازمة التقوى والمروءة.(٣)

التأصيل القرآني للعدالة

لقد حثّ القرآن الكريم في كثير من الآيات على الإلتزام بالتقوى، والإجتناب عن خصال الفسق وتوافه الأمور، ونصَّ على التثبّت والتحرّي عند تلقي الأخبار من الراوي، فيُقبل إذا ثبتت عدالته، ويُردّ إذا ثبت فيه ما يجرحه، منها قول الله جلّ وعلا:

١: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَى مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ﴾(٤)

أمرَنا الله تعالى في هذه الآية بإلغاء أخبار الفساق، وعدم قبولها قبل التحرّي، والتثبّت فيها، ولايحتج به إلا بعد النقد والمحاكمة؛ فدلّ مفهومه أن خبر العدل مقبول.(٥)

٢: وقوله تعالى:﴿وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِنْكُمْ وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ﴾(٦)

٣: وقوله تعالى:﴿ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ﴾(٧)

---

(١) مسلم،صحيح مسلم،ترقيم:فؤاد عبد الباقي،دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الخامسة،١/ ٧٤

(٢) ابن منظور الإفريقي،لسان العرب،١١/ ٤٣٠،الفيروز آبادي،القاموس المحيط،ص:١٠٣٠

(٣) السخاوي،مُحَمَّد بن عبد الرحمن،فتح المغيث،تحقيق:علي حسين علي،مكتبة السنة،مصر،الطبعة الأولى:٢٠٠٣م،٢/٥،وابن حجر العسقلاني،نزهة النظر،ص:٥٨

(٤) سورةالحجرات،الآية:٦

(٥) الجديع،عبد الله يوسف،تحرير علوم الحديث،مؤسسة الريان للطباعة والنشر والتوزيع،بيروت،الطبعة الأولى: ٢٠٠٣م، ١/ ٢٣٩

(٦) سورة الطلاق،الآية: ٢

(٧) سورة البقرة،الآية:٢٨٢

دلت الآيتان على أن الخبر لايقبل إلا ممن كان عادلًا صادقاً، وذلك لأن الله تعالى لما أوجب في هاتين الآيتين عدالة الشاهد وصدقه في حقوق العباد فدين الله أعظم من ذلك، وأحق أن يبحث له عن عدالة المخبروصدقه في نقل السنن المروية عن النبي ﷺ.(١)

الأصل العدالة أم الفسق؟

اختلف الأئمة في هذه المسألة على قولين:

١ – إن الأصل في الراوي الفسقُ. مستندُ من ذهب إليه قولُه تعالى: ﴿وَقَلِيلٌ مِنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ﴾ (٢)، وقولُه تعالى:﴿وَمَا أَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِينَ﴾(٣)

ولا يخفى أن الإستدلال به لايصح؛ لأن المراد من الآيات: أن المؤمنين عددهم قليل بالنسبة للكفار، كما يدل عليه سياق الآيات، لا أن المراد أن المؤمنين عددهم قليل بالنسبة للمسلمين الذين ليسوا عدولا.

٢ – إن الأصل فيه العدالة، وهو القول المعتمد الصحيح عند أهل الحديث، ويدلّ عليه قوله تعالى: ﴿فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا﴾(٤) فسّر العلماء هذه الآية بقول النبي ﷺ: «كل مولود يولد على الفطرة»،(٥) وفيه دلالة على أن الأصل في العبد أنه يبلغ سنّ التكليف على الفطرة، فإن كبُر، ولم يفسق، وأدّى ما كان يجب عليه، فهو عادل تقبل روايته، وإن ارتكب فسقا، فيحكم عليه بما يليق به.(٦)

عدالة الصحابة

أجمع العلماء على أن الصحابة كلهم عدول؛(٧) فلانحتاج إلى البحث عن عدالتهم وتزكيتهم؛ لأن الله تعالى رضي عنهم واختارهم لصحبة رسوله ﷺ، وهم خيرة أهل الأرض بعد الأنبياء الذين نقلوا الدين

---

(١) الجديع،تحرير علوم الحديث،١/ ٢٣٩

(٢) سورة سبأ،الآية:١٣

(٣) سورة يوسف،الآية:١٠٣

(٤) سورةالروم،الآية:٣٠

(٥) البخاري،مُحَمَّد بن إسماعيل،باب إذا أسلم الصبي فمات، هل يصلى عليه؟،رقم الحديث:١٣٥٨،دار طوق النجاة، الطبعة الثالثة،١٤٣٦هـ،٢/ ٩٤

(٦) الأمير الصنعاني،مُحَمَّد بن إسماعيل،توضيح الأفكار لمعاني تنقيح الأنظار،تحقيق:أبو عبد الرحمن صلاح بن مُحَمَّد،دار الكتب العلمية،بيروت،لبنان،الطبعة الأولى:١٩٩٧م،٢/ ٩٩

(٧) النووي،يحيى بن شرف،التقريب والتيسير لمعرفة سنن البشير النذير في أصول الحديث،تحقيق:مُحَمَّد عثمان الخشت، دار الكتاب العربي،بيروت، الطبعة الأولى:١٩٨٥م،ص:٩٢

إلى من بعدهم من الأجيال. يقول الخطيب البغدادي رحمه الله: إن الرواة يجب سبر أحوالهم والنظر في مروياتهم سوى الصحابة الذين يرفعون الحديث إلى النبي ﷺ؛ لأنه قد ثبتت عدالتهم وطهارتهم في القرآن الكريم ، وقد نص القرآن في عدة آيات على عدالتهم، منها كما في قوله تعالى:

١:﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾(١)

دلت الآية على أن الصحابة ﷺ خير الناس في هذه الأمة، ثم من فعل فعلَهم كان مثلهم.(٢)

٢:وقوله تعالى:﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا﴾(٣)

الوسط:العدل.(٤) هذه الكلمة عام؛ ولكن يراد به الخاص، ويقال:إن هذه الكلمة وردت في صحابة الرسول دون غيرهم.(٥)

٣:وقوله تعالى:﴿لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا﴾(٦)

أخبرنا الله تعالى في هذه الآية أنه رضي عن كل من بايع النبي ﷺ تحت "شجرة الرضوان"، لما رأى فيهم الوفاء بالعهد، وطاعة الأمير، وصدق المقال، فغشاهم بالطمأنينة والسكينة، وأصلح بينهم وبين أعدائهم، فرفعهم في الدنيا والآخرة، وحصل لهم بذاك العز، والعلو والنصر على أعداء الدين.(٧)

٤:وقوله تعالى:﴿وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ﴾(٨)

---

(١) سورة آل عمران،الآية:١١٠

(٢) القرطبي،محمد بن أحمد،تفسير القرطبي،تحقيق:أحمد البردوني،وإبراهيم أطفيش،دار الكتب المصرية،القاهرة،الطبعة الثانية:١٩٦٤م،٤/ ١٧٠

(٣) سورةالبقرة،الآية:١٤٣

(٤) أخرجه البخاري في صحيحه،باب قول الله تعالى: إنا أرسلنا نوحا إلى قومه أن أنذر قومك من قبل أن يأتيهم عذاب أليم، رقم الحديث:٣٣٣٩،٤/ ١٣٤

(٥) الخطيب البغدادي،الكفاية،ص:٤٦

(٦) سورة الفتح،الآية:١٨

(٧) ابن كثير،تفسير القرآن العظيم،٧/ ٣٣٩-٤٠

(٨) سورة التوبة،الآية:١٠٠

يقول الله تعالى: الذين آمنوا بالله ورسوله وسبقوا الناس فيه، وهاجروا قومهم وعشيرتهم، وفارقوا منازلهم وأوطانهم، ونصروا النبي المصطفى ﷺ على الكفار والمشركين، لقد ﷺ ورضوا عنه،[١] ولاشكّ أنها عظمة دونها كلُّ عظمة.

تدلّ هذه وما قبلها من الآيات على عدالة الصحابة وتزكيتهم، ورفعة شأنهم عند الله تعالى وهي تقتضي منا أن لاندخل في البحث عن عدالتهم، ونقبل أخبارهم بدون تردّد.

الضبط وما يتعلق به من قواعد

الضبط لغة واصطلاحا

الضبط لغةً: لزوم الشيء وحبسه، وحفظه بالحزم.[٢] وفي الاصطلاح يراد به: أن يكون الراوي متيقظا غير مغَفّل، حافظاً إن حدّث من حفظه، ضابطاً لكتابه إن حدّث من كتابه. وإن كان يحدّث بالمعنى اشتُرط فيه مع ذلك أن يكون عالماً بما يحيل المعاني.[٣]

أنواع الضبط

الضبط ضبطان: ضبط صدر، وضبط كتاب.

فالأول: هو من حفظ ما سمعه، وأثبته في صدره؛ بحيث يستطيع أن يستحضره متى شاء.

والثاني: هو أن يصونه من الخلل والتغير فيه من وقت سماعه إلى أن يؤديه.[٤]

التأصيل للضبط بنوعيه: الصدر والكتاب

يستأنس للضبط بالآيات التي تدل على أهمية الإحسان؛ إذ هو في أخص معانيه اتقان الشيء،[٥] مثل قوله تعالى:﴿قُلْ يَا عِبَادِ الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا رَبَّكُمْ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ﴾[٦]

يذكر الله تعالى في هذه الآية عباده المتّقين بالثناء عليهم بأنهم أحسنوا العمل في هذه الدنيا، فلهم حسنة في الدنيا والآخرة.[٧] فدلت الآية على أهمية الإحسان وفضله بأنه يستجلب رضا الله تعالى، ويستوجب الخير في الدنيا والآخرة؛ ولايأتي الإحسان في العمل إلا بالإتقان، فعلى الراوي أن يُحسن عمله ويتقن روايته.

---

(١) الطبري،مُحَمَّد بن جرير،جامع البيان في تأويل القرآن، تحقيق:أحمد مُحَمَّد شاكر،مؤسسة الرسالة،الطبعة الأولى:٢٠٠٠م،١٤/٤٣٤

(٢) ابن منظور الإفريقي،لسان العرب،٧/ ٣٤٠

(٣) مقدمة ابن الصلاح،ص:١٠٥-١٠٤

(٤) السخاوي،فتح المغيث،١/ ٢٨

(٥) عبد الله شعبان،التأصيل الشرعي لقواعد المحدّثين،دارالسلام للنشر والتوزيع،القاهرة،الطبعة الثانية:٢٠٠٨م، ص:٢٣١

(٦) سورةالنحل،الآية:٣٠

(٧) ابن كثير،تفسير القرآن العظيم،٧/٨٩

واستدلّ الخطيب البغدادي في كتابه "تقييد العلم" للضبط بمايأتي:

١:﴿وَلَا تَسْأَمُوا أَنْ تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَى أَجَلِهِ ذَلِكُمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَى أَلَّا تَرْتَابُوا﴾[١]

قال الخطيب: أمرنا الله تعالى في هذه الآية بأن نكتب حقوق الناس من الدَّين، وذلك للحفاظ عليه؛ ولئلايدخل الشك فيه، فالعلم الذي هو أصعب من حفظ الدَّين أولى بأن تكون كتابته مباحة، حتى لايدخل الريب والشك فيه.

٢: لما ادّعى الكفار أن الله اتخذ له البنات من الملائكة، فأنكرالله عليهم هذا القول، وأمر رسوله أن يقول لهم:﴿ فَأْتُوا بِكِتَابِكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾[٢] مشيرا إلى أن الكتابة أحد الدلائل التي يستطيعون أن يثبتوا بها دعواهم، ولكنهم لايقدرون على أن يأتوا بكتاب واحد يثبت دعواهم ، ويؤكد حجتهم.

٣: رد الله تعالى في كتابه على من يتخذون الأصنام آلهتهم، وقال:﴿أَرُونِي مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمَاوَاتِ ائْتُونِي بِكِتَابٍ مِنْ قَبْلِ هَذَا أَوْ أَثَارَةٍ مِنْ عِلْمٍ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾ [٣]

الأثرة والأثارة لهما معنى واحد، وهو ما أثر أي نقل من كتب الأولين.[٤] فهذه الآيات كلها تدل على جواز حفظ العلم الديني في الصدر والكتاب.

الشذوذ لغةً واصطلاحاً، والتأصيل لنفيه

الشذوذ لغة واصطلاحا

الشذوذ في اللغة: الانفراد عن الجمهور، والخروج عن الجماعة.[٥] ومنه:الشاذ.أما في الاصطلاح: فقد اختلفت أنظار العلماء فيه، وتعددت أقوالهم، فتعريفه أصبح أمر غير يسير. وما ذهب إليه الشافعي هوالأصح، وأصوب، وبه أخذ جمهور المحدّثين. يقول الإمام الشافعي رحمه الله:"ليس الشاذ من الحديث أن يروي الثقة مالايروي غيره، إنما الشاذ أن يروي الثقة حديثا يخالف ماروى الناس".[٦]

---

(١) سورةالبقرة،الآية:٢٨٢

(٢) سورةالصافات،الآية:١٥٧

(٣) سورةالأحقاف،الآية:٤

(٤) الخطيب البغدادي،أحمد بن علي بن ثابت،تقييد العلم،إحياء السنة النبوية،بيروت،بدون ذكر الطبعة وتاريخ النشر،ص:٦٩

(٥) الرازي،مختار الصحاح،ص:١٦،وابن منظور الإفريقي،لسان العرب،٣/٤٩٤،والفيروزآبادي،القاموس المحيط،ص:٣٣٤

(٦) العراقي،التقييد والإيضاح:ص:١٠١،وابن كثير،إسماعيل بن عمر،الباعث الحثيث إلى اختصار علوم الحديث،تحقيق:أحمد مُحَمَّد شاكر،دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الثانية، بدون ذكر تاريخ النشر،ص:٥٨،والسخاوي،فتح المغيث،١/ ٢٤٩

التأصيل لنفي الشذوذ

لايُقبل الحديث الشاذ عند أهل الحديث؛ لأن راويه خالف فيه ما اتفق عليه الثقات، وأتى بما لايعرفونه، وعدمُ معرفته عذر في عدم قبوله، وموجبٌ للتشكك في قوله،[١] وفي "التنزيل العزيز":﴿أَمْ لَمْ يَعْرِفُوا رَسُولَهُمْ فَهُمْ لَهُ مُنْكِرُونَ﴾[٢]

يقول الله جل وعلا: أولم يعرف المكذّبون رسولهم، وصدقه في الكلام، وأمانته في الأمور؟ فلماذا ينكرون قوله، ولايقبلون ما أنزل عليه؟ أفيقدرون بعد معرفتهم إياه على الإنكار؟ والحق أنه لايقدر على الإنكار إلا شقيٌّ ومعاندّ، لولم يعرفوه لكان لهم عذر.[٣]

بذلك عُرف أن عدم المعرفة بحديث راو، يورث الشك في روايته، ويؤدي إلى عدم القبول به.

معنى العلة لغةً واصطلاحاً، والتأصيل لنفيها

العلة لغة واصطلاحا

العلة لغة: المرض، واسم المفعول منه: معلّ. ومنه: الحديث المعلّ.[٤]وفي الاصطلاح: العلة عبارة عن سبب غامض خفي قادح في الحديث، مع أن الظاهر السلامة منه،[٥] وعلى ذلك فالحديث المعلل كما قال علماء الحديث: "هو الذي اطلع فيه على علة تقدح في صحته مع أن ظاهره السلامة منها".[٦]

التأصيل لنفي العلة

يمكن الاستدلال على نفي العلة بأمور:

أن مقصود الشرع أن يكون باطن الإنسان خيرا من ظاهره، والعلة وصف خفي غامض مع أن ظاهر الأمر السلامة منها؛ فهي تشبه في أحكام الشرع أمر النفاق، من حيث إنه مرض، والعلة كذلك في أحد مدلولاتها اللغوية، ومن حيث الخفاء والغموض، ومن حيث ظاهرية السلامة منه.

وقد ذمّ الشرع النفاق وفضح المتصفين به لمايترتب عليه من مخاطر وآفات، كما نفى عنهم حقيقة الإيمان الذي أعلنوه بألسنتهم؛ قال الله تعالى:﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُمْ

(١) انظر: الأمير الصنعاني،توضيح الأفكار:٢/ ٢٣

(٢) سورة المؤمنون،الآية:٦٩

(٣) الطبري،جامع البيان في تأويل القرآن:١٩/ ٥٦،وابن كثير،تفسير القرآن العظيم،٥/ ٤٨٤

(٤) الرازي،مختار الصحاح،ص:٢١٦،وابن منظور الإفريقي،لسان العرب،١١/٤٧١

(٥) السيوطي،تدريب الراوي،١/٢٩٥

(٦) العراقي،التقييد والإيضاح،ص:١١٦

بِمُؤْمِنِينَ، يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ، فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ﴾[1].

أهم نتائج البحث والتوصيات

أهم ما وصلنا إليه خلال البحث المختصر من البحر العميق الذي وجدناه في هذا الصدد ما يتلخص في النقاط الآتية :

١- أن المحدثين رحمهم الله لم يقعدوا أي قاعدة أو مصطلح من المصطلحات في علم الحديث إلا ولديهم ما يكفيهم من الأدلة التي تدل على إثبات هذه المصطلحات من القرآن والسنة.

٢- أن علماء التفسير وجدنا لهم باعا كبيرا في إظهار دلالات الآيات القرآنية لمصطلحات علماء الحديث في علم الحديث.

٣- أن هذا الموضوع ذو أهمية بالغة وخاصة في هذا العصر الذي انتشر الكلام على علم الحديث بكلام من طرف أناس لا علاقة لهم بهذا العلم الشريف.

٤- الذي تم الوصول إليه في هذا البحث المختصر هي إشارات ينبغي أن تفصل في المؤلفات في هذا الموضوع، ولعل الله ييسر لهذا الأمر أناس حتى يبين لأولئك الطاعنين في هذا العلم الشريف الذي هو أحد نوعي الوحي المنزل.

٥- الآيات التي استنبطنا منه قواعد "علم الحديث" بلغ عددها إلى تسع وعشرين آية. استنبطنا منها خمس عشرة قاعدة رئيسية من قواعد هذا الفن الجليل.

٦- ينبغي أن يقوم أحد الباحثين بدراسة وافية لأصول الحديث عند المذاهب الأربعة، ويقارن بينها مع الترجيح لما هو أقرب إلى الكتاب والسنة.

❁ ❁ ❁

(١) سورةالبقرة،الآية:٨-١٠،وعبد الله شعبان،التأصيل الشرعي لقواعد المحدّثين،ص:٤٤٧

التوازن بين حقوق المرأة وواجباتها في الشريعة الإسلامية

Rights and Duties of Women in Islamic Law (A Balanced and Realistic Approach)

د. لطف الله ثاقب*

د. شفيقه بشرىٰ**

ABSTRACT

It is not possible to create stability and balance in a society if its basic pillars, both men and women, are not aware of their fundamental rights and duties. A best society, therefore, is that where there is a balance and realistic approach towards the rights and duties of the people. Being a complete code of life, Islam has introduced, for the first time in the history, a strong mechanism and structure, both at theoretical and practical level, for the assurance of such balanced approach of rights and duties. While following this, Islam has given the rights of life, right of education, right of better teaching, right of fairness, right of alimony and etc., to both man and woman, without any sort of discrimination. The same principles are followed for awarding duties. However, some relaxation is given to a woman, owing to the fact of her soft nature, in term of duties. Some orientalists, particularly those who are not familiar with the teachings of Islam, point out that predominance has been given to man in terms of rights. The purpose of this work is to root out such misconception through solid arguments-both from the Holy *Qur'ān* and *Sunnah* of the Holy Prophet (ﷺ).

Key words: *Rights, Duties, Balance, Women, Islam, Qur'ān, Sunnah.*

* الأستاذ المساعد،قسم القانون والشريعة،جامعة سوات

** الأستاذة المساعدة،قسم القانون والشريعة،جامعة سوات

تمهيد

هذا مبدأ الطبيعة (Principle of Nature) توقع لنا لأداء واجباتنا ومسؤلياتنا على أساس الحقوق، جعل الله التوازن (Balance) بين حقوق المرأة وواجباتها، بسب هذا أن تكون قادرة على أداء واجباتها بكفاءة وفعالية. ومنح لها من الحقوق ورفع مكانتها وأعلىٰ من شأنها بالنسبة لماكانت عليه قبل الإسلام. مالم يكن التوازن بين واجبات المرأة وحقوقها في العصر الجاهلى، لديها واجبات كثيرة فليس لها حقوق مثل قد أباح الجاهليون للرجل تعدد الزوجات، والجمع بين أى عدد شاء من الأزواج دون تحديد، أما الاكتفاء بأمراة واحدة أو باثنين أو اكثر، فذلك أمر خاص يعود إليه كما أباح التشريع الجاهلي للرجل أمتلك أى عدد يشاء من الإماء، وتكونُ الأمة ملكاً للرجل لأنه اشتراها بذات يمينه، وهي ملكة مادامت أمة في ملك سيّدها فليس لها حقوق الزوجة.

ولمّاً جاء الإسلام جعل التوازن بين الحقوق والوجبات (Right and Duties) النساء على سبيل المثال: حَدَّد الإسلام تعدد الزوجات أن قيد العدد بأربع. فأكرم المرأة فدعا إلى العناية بها، والعطف عليها، وتعيّن حقوقها قال الله تعالى: ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾. ولقد كرَّم الله سبحانه وتعالى المرأة بالإسلام، ورفع من شأنها، وأعلىٰ منزلتها، وحَرّرها من قيود الظلم والتعسف. وأعطاها وحريتها وحقوقها الإنسانية كاملة.ومن الواضح أن مكانة المرأة في ضوء القرآن والسنة هو المساواة التامة في ما يختص باالعبادات والواجبات الدينية كذلك خصّها الإسلام بالتكريم كذلك كما وردت الآيات في القرآن الكريم التي تؤكّد التسوية(Equality) بين الرجل والمرأة. وفي العصر الحديث يعترض المخالفون للشريعة الإسلامية، كما خالف ورفض الغربيون المسيحية بقضايا المرأة في نصيبها من الإرث، وفي شهادتها، وفي لباسها، وفي تعدد الزواجات، وفي الطلاق، وفي قضايا التنظيم الأسري، ومبدأ القوامه يعنى سلطة الزوج إنما يعود لاعتبارهم رئاسة الرجل على المرأة رئاسة تقوم على الاستبداد الظلم بينما هي في الحقيقه رئاسة رحمه ومودة. لكن في الحقيقته المرأة في الرجل سكناً ومصدراً للمودة الحنان والرجل لها ذلك.

ويقول مُحَّد قطب شهيد في كتابه شبهات حول الإسلام: "إن "القوامة" في الشريعة دلالة قيام الرجل بالنفقة على أسرته، والقيام على مصالحها ورعايتها، وحسن الخلق معها، والجود والكرم، وكل ما من شأنه أن يوفّر لمؤسة الأسرة الراحة، والطمانيتة، والحرية، والمودة الرحمة، وهي القوامة رعاية وإدارة، وليست قوامة هيمنة وتسلط"[١]. كان الإسلام قد خصّص بعض الميادين للرجل لقوله تعالى:﴿الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ﴾[٢]

(١) مُحَّد قطب شهيد،شبهات حول الإسلام،دار الشروق بيروت،١٩٩٢م،ص: ١٢٢

(٢) سورة النساء،الآية:٣٤

وبعضها للمرأة لكى يُكملا واجبات الحياة. رفع الإسلام شأن المرأة، وفتح لها بابا لحقوقها في قائمة أبواب التشريع، وتسوية المرأة بالرجل، والرجل بالمرأة من الأسس (Basics) التي بنى عليها نظام العائلة الإسلامية الهدف الرئيسي من هذا البحث هو فهم التوازن بين حقوق المرأة واجباتها في الشريعة الإسلامية. أما الاهداف (Objectives) الأخرى فهي:

١. فهم حقوق المرأة ودورها في المجتمع.
٢. فهم ميزان الشريعة الإسلامية مع اشارة خاصة(with a Special Reference) إلى حقوق وواجبات المرأة.
٣. فهم الخطوات العملية التي اتخذت الإسلام لتمكين المرأة.

منزلة المرأة في المجتمع الإسلامي

المرأة نصف المجتمع (Half of the Population) ، وأجمل ما في المجتمع من عواطفها، قبل الإسلام لم تنل مكانتها الاجتماعية، وليس لها حقوق .ولماً جاء الإسلام قدَّر لها حقوقاً كحقوق الرجل للمرأة في أي مجتمع كانت وفي أي زمان عاشت ولها دور بالغ الأهمية في حياة الأمم والأفراد، فهي نصف المجتمع وتؤثر سلباً أو إيجاباً (Positively or Negatively) في نصفه الآخر. فالمرأة هي مربية الأجيال، وصانعة الرجال، ومعها يقضي الأبناء أطول فترات حياتهم(١)، الإسلام يريد وضع المرأة في الإطار الكامل، وبعد ذلك إذا نظرنا إلى الإسلام بعد إعطائه المرأة كرامة إنسانية. ومساواة مع الرجل في الحقوق، والواجبات، وحقها المدني كاملاً، وفرض التعليم، ومن ذلك يعطيها أنها سيدة البيت(٢)مساواة المرأة بالرجل في أصل الخلقة، والكرامة الإنسانية، ووحدة الأصل والمنشأ والمصير(٣). يقول الله تعالى في ذلك: ﴿يأَيُّهاالنّاسُ اتَّقُوا رَبَّكمُ الَّذِيْ خَلَقَكمْ مِنْ نَفْسٍ واحِدَةٍ وخَلَقَ مِنْهَاْ زَوجَها وبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كثيراً ونِسَاءً واتَّقُوا الله الَّذِيْ تَسَاءَ لُونَ بِه والْأَرْحَام﴾(٤). ويقول الله عزوجل: ﴿وهوالَّذِى خَلَقَكمْ مِنْ نَفْسٍ واحِدَةٍ وجَعَلَ مِنْهَا زَوجَهَا لِيسْكنَ إلَيْهَا﴾(٥). وقال الله تعالى: ﴿والله جَعَلَ لَكمْ مَنْ أنفُسِكمْ أزْواجاً وجَعَلَ لَكمْ مِنْ أزوجِكمْ بَنِيْنَ وحَفَدَةً

(١) مروان إبراهيم القيسي،المرأة المسلمة والعقيدة الإسلامية،مجلة الدراسات الإسلامية،الطبعة الثانية:١٩٩٧م،ص:٣٨،٣٩
(٢) الشعراوي،مُحَمَّد متولي،كيف نفهم الاسلام،دار العودة،بيروت،١٩٨٨م،ص: ٤٣
(٣) الدكتور مكيّة مرزا، مشكلات المرأة المسلمة المعاصرة، دار المجتمع،١٩٩٠م، ص:١٩
(٤) سورة النساء،الآية:١
(٥) سورة الأعراف،الآية:١٨٩

ورَزَقَكمْ مِنْ الطَّيِّبَاتِ﴾[١]. ويقول جلّ وعلا: ﴿ومِنْ آياتِهِ أنْ خَلَقَ لَكمْ مِنْ أنْفُسِكمْ أزْواجاً لِتَسْكنُوا إلَيْهَا وجَعَلَ بَيْنَكمْ مَودَّةً ورَحْمَةً إنَّ فِي ذَلِك لَايَاتٍ لِقَومٍ يَتَفَكرُونَ﴾[٢].

ومِمَّا يؤكد ذلك من السنة ما رواه البخارى عن أبي هريرة ﷺ عن النبي ﷺ قال:«من كان يؤمن بالله واليوم الآخر، فلا يؤذي جاره، واستوصوا بالنساء خيراً، فإنهنّ خلقن من ضلع، وإن أعوج شئ في الضلع أعلاه، وإن ذهبت تقيمه كسرته، وإن تركته لم يزل أعوج، فاستوصوا بالنساء خيراً»[٣]. فهذه المناسبات من القرآن والحديث النبوى ﷺ تدل على تعامل الحسن مع النساء.

وقد شاركت المرأة في الحياة السياسية (Political Life) مشاركة فعّالة (Active Participation)، ولعبت دوراً خطيراً في مسألة خلافة الرسول ﷺ، وتكريم المرأة هو أهم ما نادى به الإسلام لإصلاح الأسرة التي كانت قبلة تتخبّط في الظلام، فقد بلغ الإسلام في تكريم المرأة مالم يبلغه تشريع اجتماعي في القديم ولا في الحديث[٤].وقد دعاء الدين إلى محبة المرأة: "إنّما النساء شقائق الرجال"[٥]. فهي كالرجل في المطالبة بالتكاليف الشرعية والجزاء والعقاب قال الله تعالى : ﴿ومَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكرٍ أُنْثى وهُومُؤْمِنٌ فَأُولئِك يَدْخُلُونَ الجَنَّة ولاَ يُظْلَمُونَ نَقِيْراً﴾[٦].

شاركت المرأة المسلمة مع الرجل جنباً إلى جنب في الكفاح ونشر الإسلام (Preaching of Islam)، والمحافظة عليه. فقد اشتركت المرأة المسلمة في أول هجرة للمسلمين إلى الحبشة، وكذلك في الهجرة إلى المدينه المنورة، وخرجت مع الرجال في الغزوات التي قادها الرسول ﷺ لنشر الإسلام، واشتركت في ميادين القتال ليس فقط لتمريض الجرحى، بل للمقاتلة بالسيف أيضا بالرغم من أنها معفاة من الجهاد، ومن حمل السلاح. وأن أول شهيدة في الإسلام هي امرأة تمسكت بالدين الإسلامي وبالتوحيد واستشهدت وهي تردد"أحد .. أحد"كما اشتركت النساء في مبايعة الرسول ﷺ. فقد بايعت (Oath) النساء المسلمات النبي ﷺ في بيعتي العقبة الأولى والثانية. وفي هٰذا المجال أوصى الدين بإكرام المرأة، ورفع شأنها، وعَدَّها نعمة عظيمة، وهبةً كريمةً، يجب إكرامها قال الله تعالى: ﴿للهِ مُلْك السَّمٰوٰاتِ والأرْضِ يَخْلُقُ مَايشاء يَهَبُ لِمَنْ يَشَاءُ

---

(١) سورة النحل،الآية:٨٢

(٢) سورة الروم،الآية:٢١

(٣) البخاري،الصحيح،كتاب النكاح،باب الوصايا بالنساء،دار مطابع الشعب،٣٤/٧

(٤) ليم التيتر،الشاعرات من النساء،ص:٣١،نقلا عن د.صبحي الصالح،النظم الإسلامية نشأتها وتطوّرها،دارالعلم، الملامين،بيروت،١٩٧٨،ص:٤٤١

(٥) أحمد بن حنبل،مسند،دار الكفر،بيروت،٢٥٦/٦

(٦) سورة النساء،الآية:١٢٤

إِنَاثا ويَهَبُ لِمَنْ يَشَاءُ الذُّكور﴾[١]. وكذلك قوله تعالى في احترام الوالدين وخاصة في حق الأم. فقال الله تعالى:﴿ووصَّيْنالإنسانَ بِوالِدَيْهِ حَمَلَتْه أُمُّه وهْنًا عَلىٰ وهْنٍ وفِصَالُه فِيْ عَامَيْنِ أنِ اشْكُرْلِي ولِوالِدَيْك إلَيَّ المصِيْرُ﴾[٢]. والحق أعطى الإسلام تسوية المرأة بالرجل، والرجل بالمرأة من الأسس التي بنى عليها نظام العائلة الإسلامية والمجتمع الإسلامي. المرأة نصف المجتمع فهي أساس التربية، وغرس المفاهيم الأساسية في أطفالها الذين هم بناة المستقبل، وصنّاع الغد.

حقوق المرأة في الشريعة الإسلامية

عند ما ننظر إلى الشريعة الإسلامية فإنها اعطت المرأة مساواة وتعادل مع الرجال في جوانب ومظاهر متعددة ومتنوعة من الحياة. فالفقرات التالية ستثبت هذه بالحجة واالبرهان قد خاطب الله سبحانه وتعالى المسلمين في ما يتعلق بالنساء عَلى قدم المساواة، وكذلك أمرالله التسوية بينهم في الثواب والعقاب، كما قال الله تعالى: ﴿أنِّي لاَ أضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِنْكمْ مِنْ ذَكرٍ أوأنثى بَعْضُكمْ مِنْ بعضٍ﴾[٣]. ويقول: ﴿ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِمَّا اكْتَسَبْنَ وَاسْأَلُوا اللَّهَ مِنْ فَضْلِهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ﴾[٤]. قال الرَّسولُ ﷺ في حَقِّهِنَّ: «اللَّهُمَّ إنِّي أُحَرِّجُ حَقَّ الضَّعِيفَيْنِ: الْيَتِيمِ، وَالْمَرْأَةِ»[٥]. وقال الرَّسول ﷺ:«مَنْ كان يؤمن باللهِ واليوم الآخِر فلايُؤْذِيْ جَارَهُ، واستوصُوا بالنِّسَاءِ خيراً، فَإنَّهُنَّ خُلقنَ مِنْ ضِلَعٍ، وإنَّ أعوجَ شيءٍ في الضِّلَعِ اعلاهُ، فإنْ ذهبتَ تقيمُهُ كسرتَهُ، وإن تركتَه لم يزَلْ أعوجَ، فاستوصُوا بالنِّساءِ خيراً». وقد تأتى الوصيَّةُ بطلب الرِّفق بهنَّ مع استعمال الكناية عنها[٦]. ومن ذلك ما ورد في حديث أنسٍ ﷺ عن النَّبيُّ ﷺ أنَّه قال: «ارْفُقْ يا أنجشةُ ويحَك بالقواريرَ» وفي رواية عنه «رويدَك يا أنجشةُ سوقَك بالقواريرَ» وكذلك:« يَا أَنْجَشَةُ رُوَيْدَكَ سَوْقًا بِالْقَوَارِيرِ»[٧].

---

(١) سورة الشورىٰ،الآية:٤٩

(٢) سورة لقمٰن،الآية:١٤

(٣) سورة آل عمران،الآية:١٩٥

(٤) سورة النساء،الآية:٣٢

(٥) ابن ماجه،سنن،كتاب الأدب،باب حق اليتيم،رقم الحديث:٣٦٧٨،دار إحياء الكتب العربية،فيصل عيسى البابي الحلبي،ص:١٢١٢

(٦) رزان،الحكيم عبده،صورة المرأة في الحديث النبوي،دارالفكر دمشق،الطبعة الأولى:٢٠٠٨م،ص:٢٢

(٧) البخاري،الصحيح،كتاب الأدب،باب المعاريض مندوحة من الكذب،رقم الحديث:٤٢٠٩،٤٢١٠،٤٢١١،ومسلم، الصحيح،كتاب الفضائل،باب رحمة النبي للنساء وأمر السواق،رقم الحديث: ٢٣٢٣،دار إحياء التراث العربي،بيروت، ص:١٨١١

والآن نطرح الضوء في حقوق وفرائض المرأة، وكذلك نوضح أيضا أن الله سبحانه وتعالى جعل التوازن بين حقوق المرأة وفرائضها على أساس الحكمة. وأن الشريعة الإسلامية أعطاها حقوقها، وأعلن كرامتها، وقرّر حقوقها وهي التي سيتم مناقشتها على النحو التالي.

حق الحياة

إن المرأة لم يكن لها نصيب (Share) حق الحياة في الجاهلية، وكانت تكره على البغاء والأدهى ذلك قيام الآباء بوأد بناتهم بعد ولادتهن خوفاً من العار أو الفقر، وقد ذمّ الله سبحانه الإستهانة بأمر البنات بمثل قوله وهو من أبلغ الذم: ﴿وإذا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بالْأنثى ظلَّ وجْهُهُ مُسودًّاوهُوكظيمٌ، يَتَوَارَى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ أَيُمْسِكُهُ عَلَى هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ أَلَا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ﴾[١]. الثانيه إما مخافة الحاجة والإملاق وإما خوفاً من السبي والاسترقاق[٢]. وقال تعالى:﴿قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوا أولادَهُمْ سَفَهًا بغير عَلْمٍ وحرّموا مَارزقهُمْ اللهُ افتِرَاءً على الله قد ضلُّوا ومَا كانوا مُهْتَدِيْن﴾[٣]. وفي هذه الآية: أيضا يقول الله:﴿ وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِنْ إِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ ﴾[٤]. وفي هذه المسألة أيضا يقول الله:﴿وكذلك زيَّنَ لكثير مِنَّ المشركينَ قتل أولادِهِمْ﴾[٥].وجاء في الآية أيضا﴿ وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خشية إملاق نَحْنُ نرزقُهمْ واياكمْ إنَّ قتْلَهُمْ كانَ خِطْأً كبيراً﴾[٦].

فإن الإسلام قد كرّم المرأة، وكفل لها حق الحياة، ونهى عن قتلها ووأدها، ولها حق الحياة الكريمة عليها، وكرّمها كطفلة بتحريمه لظاهرة وأد البنات التي كانت شائعة (Prevaling) في الجاهلية، وقال عزّوجلّ:﴿وإذا الموءُ دَةُ سُئِلَتْ، بِأيْ ذَنْبٍ قُتِلَتْ﴾[٧]. شكل النبيّ ﷺ سياجاً حمى به البنت بادئاً بالحفاظ على حياتها من الوأد الّذي عرفته العرب فانتشر في بعض قبائلها[٨]. عن المغيرة بن شعبةَ عن النبى صلى الله عليه وسلم قَالَ: «إنَّ الله حَرَّم عَلَيْكمْ عُقُوقَ الأمَّهَاتِ، ومنعًا وهاتِ وأد البناتِ. وكره لكم قيل وقال، وكثرةَ السُّؤالِ وإضَاعة المالِ»[٩]. وقال الرسول ﷺ:« مَنْ كَانَتْ لَهُ أُنْثَى فَلَمْ يَئِدْهَا، وَلَمْ يُهِنْهَا، وَلَمْ يُؤْثِرْ وَلَدَهُ عَلَيْهَا،

(١) سورة النحل،الآية: ٥٨،٥٩
(٢) القرطبي،عبدالله بن أحمد،الجامع لأحكام القرآن،دار الكتاب العربي،القاهرة،١٩٦٧م،٢٣٢/١٠
(٣) سورة الانعام،الآية:١٤٠
(٤) المصدر السابق:١٥١
(٥) المصدر السابق:١٣٧
(٦) سورة بني إسرائيل:٣١
(٧) سورة التكوير،الآية: ٨،٩
(٨) رزان الحكيم عبده،صورة المرأة في الحديث النبوى،ص:١٥٩
(٩) البخاري،الصحيح،كتاب الأدب،باب عقوق الوالدين من الكبائر،رقم الحديث:٩٧٥.

– قَالَ: يَعْنِي الذُّكُورَ – أَدْخَلَهُ اللَّهُ الْجَنَّةَ »[١]. وأمَّا "عال" فقد وردت في ما رواه أنسْ بنُ مالك ﷺ قال: قال رسول الله ﷺ: «من عال جارِيَتينِ حتّى تبلُغَا جَاء يومَ القِيامةِ أنا وهُو وضَمَّ أصابعهُ»[٢]. لقد رفع الإسلام مكانة المرأة، واختصها بامتيازات كثيرة، وخصها بالتكريم بوصفها أُماً، ومنحها مكانة عالية في الجنة، وخير الناس خير هم لأهله وأمرالله سبحانه وتعالى الزوج بالإتفاق عليها، وإحسان معاشرتها، وجعل لها نصيباً من الميراث.

حق التعليم والتربية

وقد وضعت سابقًا فكرة تكريم الإسلام للمرأة، ومساواتها بالرجل في الحقوق والوجبات، وبيّنت أنها شقيقة الرجل لا تفاضل بينهما إلا بالتقوىٰ. ومن التقوى الأخلاق الفاضلة كالإيمان بدرجاته، والعلم النافع، والخلق الحسن، والصبر والحلم، فالمرأة المسلمة بدرجاته الإيمان، أو المليئة علمًا، ولا فضل لأحد على أحد إلا بالتقوى والفضيلة قال الله تعالى: ﴿ياأيُّهَاالناسُ إنَّا خَلَقْنٰكمْ مِنْ ذكرٍ وأُنثى وجَعَلْناكم شعوباً وقبائل لتعَارَفُوا إنَّ أكرَمَكمْ عِنْدَالله أتْقٰكمْ﴾[٣]. نضيف هنا ببيان أن الإسلام قد حارب عادة التشاؤم من ولادتهن وامتهانهن، وذلك لأن كلا من الذكور والإناث في الأصل هبة الله للإنسان، ويكفي لمن يكره البنات قبيحاً وشناعةً أن يكره ما وهبة الله إياه، ومنحه من الذرية التي لو حرم منها لظلّ بائسًا حزينًا[٤]. يقول الله تعالى: ﴿يَخْلُقُ مَا يشاءُ يَهَبُ لِمَنْ يشَاءُ إناثًا ويَهَبْ لِمَنْ يشاءُ الذُّكورَ﴾[٥]. وفي السنة ورد كثير من الأحاديث الصحيحة التي تحث على إكرام البنت، وتربيتها، وتعليمها، والإحسان إليها، وجعل لتربية البنات أجراً عظيما، ومن ذلك قوله ﷺ:« مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ حَتَّى تَبْلُغَا، جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَنَا وَهُوَ وَضَمَّ أَصَابِعَهُ»[٦]. ماروى البخاري أن رسول الله ﷺ قال:«ورجل كانت عنده أمة فأدبها فأحسن تأدّيبها وعلمها فأحسن تعليمها، ثم أعتقها فتزوجها فله أجران»[٧].

فالنَّبيّ يطلب الإحسان في تربية البنات ممن كان يراهن عاراً، وبذلك يقدم عرضاً سخيًّا (Generous) لكل مسلم، الجنَّة ونعيمها مقابل رعاية البنات داخل الأسر. فمن البيان النَّبوى كثير يقرن

---

(١) أبو داود،سنن،باب النهي عن كثرة المسائل من غير حاجة،رقم الحديث:٥١٤٦، المكتبة العصرية، صيدا،بيروت،ص: ٣٣٧

(٢) مسلم،الصحيح،كتاب الْبِرِّ وَالصِّلَةِ وَالْآدَابِ،بَابُ فَضْلِ الْإِحْسَانِ إِلَى الْبَنَاتِ،رقم الحديث:٢٦٣١،ص:٢٠٢٧

(٣) سورةالحجرات،الآية:١٣

(٤) دكتور مكيّه مرزا،مشكلات المرأة المسلمة المعاصرة،ص:٢٢٧

(٥) سورة الشورىٰ،الآية:٤٩

(٦) مسلم،الصحيح،كتاب البروالصلة،باب الإحسان إلى البنات،رقم الحديث:٤، ٢٠٢٨/٢٦٣١

(٧) البخاري،الصحيح،كتاب العلم،باب تعليم الرجل أمته وأهله،رقم الحديث:٣٥/١،٩٧

ذكر البنات بالأخوات صراحة[١]. روى أنسُ ﷺ قال، قال رسولُ الله ﷺ:«منْ عال ابنتينِ أوثلاثَ بناتٍ، أو أختين أو ثلاثَ أخواتٍ، حتى يُمُتْنَ أو يموتَ عنهنَّ، كنتُ أنا وهُو كهاتينِ» وأشارَ بأُصْبُعَيْهِ السَّبَّابةِ والوسُطى[٢]. فالتربية الصحيحة للفتاة لابد فيها من العناية الخاصة والإشراف الدقيق سواء في البيت أو المدرسة على يد الأمهات الفاضلات والمربيات اللاتي يتصفن بالخيرة، والأخلاق الحميدة، والعقل المستنير، والنفس الكبيرة، والروح المؤمنة الشفافة؛ لأن مهمة التربية أمانة كبرى ومسؤولية عظمى[٣].

حق التربيه للحياة الزوجية

فالمرأة المسلمة في طفولتها حق الرضاع، والرعاية واحسان التربية. لَعلَّ البيت يشمل جميع مايتمُّ فيه من تنظيم وتنظيف وإعداد طعام... ولهذا ما تسأل المرأة عنه عادة، ولا يمكن أن يكون ذلك هوالمقصود الوحيد؛ لأن المرأة يحقُّ لها أن تستعين بخادم وبمرضِع إن لم ترغب بإرضاع أولادها وبمن سواهما، وهذا يعني أنَّها من الممكن ألاّ تقوم بشيئ من تلك المهمَّات (Duties)، وتكتفي هي بالإداره والتنظيم، وهذا لن يستغرق منها يومها كلَّه، فمسؤوليَّتُها عن البيت ليست محصورة[٤]. وفي ذلك يقول الرسولُ ﷺ: «والمرأة راعية على بيت زوجها وولده فكلكم راعٍ وكلكم مسؤول عن رعيته»[٥]. في جب أن تدرب الفتاة على الطهر والتنظيف والترتيب وإعداد كل شئ كما يجب معرفة مايحتاج إليه العش الزوجى من حسن إشراف وعناية، وما يمنع عنه أكبر قدر من الفساد، والاضطراب، ولا يتم ذلك في يوم وليلة بل يتم ذلك بالتدريب والمرأة منذ فترة المراهقة، بل وقبل ذلك منذ فترة الطفولة المتأخرة بالتدريج مع الإعداد الجاد في فترة الشباب. لما تحتقر المرأة تلك الأعمال في نشا الصراع والمشاكل بين الزوج وزوجته، التي تنتزع السكون والطمأنينة اللذين جعلهما الله آية في الزوج[٦]. ﴿ومن آياتِهِ أنْ خَلَقَ لَكمْ مِنْ أنْفُسِكمْ أزواجاً لِتَسْكنُوا إلَيْهَا﴾[٧]. فلذا فإن أخذها بنصيب وافر من التعليم، وبخاصة العلوم الإنسانية والاجتماعية (Humanties and Social Sciences) يجعلها أقدر على تفهم خصائص زوجها[٨]. لكل المرأة في الحصول على التعليم والتربية، واكتساب المهارة الإنسانية، وأمور البيت، ويجب على

---

(١) رزان الحكيم عبده،صورة المرأة في الحديث النبوى،ص: ١٧٥
(٢) أحمد بن حنبل،مسند أنس بن مالك،رقم الحديث:١٢٤٩٨
(٣) الدكتور مكيّة مرزا،مشكلات المرأة المسلمة المعاصرة،ص:٢٤٦
(٤) رزان الحكيم عبده،صورة المرأة في الحديث النبوي،ص:١٧٥
(٥) البخاري،الصحيح،كِتَابُ الجُمُعَةِ ،بَابُ الجُمُعَةِ فِي القُرَى وَالمُدُنِ،رقم الحديث:٨٩٣،٢١/٧
(٦) الدكتور مكية مرزا،مشكلات المرأة المسلمة المعاصرة،ص:٢٤٦
(٧) سورة الروم،الآية:٢١
(٨) الدكتور عمارة نجيب،الأسرة المثلى في ضوء القرآن والسنة،مكتبة المعارف،الرياض،الطبعة الثانية:١٤٠٠هـ،ص:٣٦

الوالدين أن يغرسا في قلبها معاني الإيمان بالله وبرسله الكرم عليه الصلاة والسلام، ومحبة الناس وكراهية الشر ومحبة الخير، لأن المرأة نصف المجتمع، التي تربي الأجيال (Generations).

حق الإرث

أعطى الإسلام المرأة حق الميراث(Inheritance) ورعايه حقوقها، وفي العصر الجاهلي (Dark Age) ليس لها حقوقاً، وليس لها حق الميراث، وقد منحت الشريعة الإسلامية للمرأة حقها في الميراث فقد حفظ الإسلام حق المرأة على أساس من العدل والإنصاف. إنَّ الإسلام أعطى المرأة حَقًّا في الإرث، أي (الرجل والمرأة) له الحق في الإرث والتوارث على النحو الذى وضعته شريعة الإسلام مراعية فيه أسمى قواعد العدل إذ تجري التوزيع حسب الحاجة الطبيعية، أومتطلبات كل منهما وحكمة ظاهرة أو خفية يعلمها الخبير العليم، قال الله تعالى مقرراً مبدأ استحقاق كل منهما في الميراث[١] ﴿ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَفْرُوضًا ﴾[٢].

ثم قدّر حق التوارث بين الزوجين وبين نصيب كل منهما، للزوجة واحدة أو اكثر في إرثها من زوجها المتوفي حالتان:

١. أن ترث الربع وذلك إذ لم يكن لزوجها المتوفي فرع وارث منها أو من غيرها، ذكراً كان أو أنثى، مباشراً وغير مباشر.
٢. أن ترث الثمن وذلك إذا كان لزوجها المتوفي فرع وارث منها أو من غيرها، ذكراً كان أو أنثى مباشراً أو غير مباشر[٣].

والدليل على إرث كل من الزوجين وأحوال إرثهما قول الله تعالى:﴿ولَكمْ نِصْفُ مَا تَرَك أزواجُكمْ إن لَمْ يَكنْ لَهُنَّ ولَدٌ فإنْ كانَ لَهُنَّ ولَدٌفَلَكمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكنَ مَنْ بَعْدِ وصِيَّةٍ يُوصِيْنَ بهَا أودَيْنٍ ولَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّاتَرَكتُمْ إنْ لَمْ يَكنْ لَكمْ ولَدٌ فإنْ كان لَكمْ ولَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكتُمْ مِنْ بَعْدِ وصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أودَيْنٌ وإن كان رَجُلٌ يُورَثُ كلالَةً أوامْرَأةٌ وله أخٌ أوأخْتٌ فلِكلِّ واحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُس فإن كانُوا أكثَرَ مِنْ ذَلِك فَهُمْ شُرَكاءُ في الثُّلُثِ مِنْ بَعْدِ وصَيَّةٍ يُوصِىْ بِهَا أودَئنٍ غَيْرَ مُضَار وصيَّةً مِنَ اللهِ واللهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ﴾[٤].

---

(١) الدكتور عمارة نجيب،الأسرة المثلى في ضوء القرآن والسنة،ص:٣٧

(٢) سورة النساء،الآية:٧

(٣) الجليدى،الدكتور سعيد مُحَمَّد،أحكام الميراث والوصية في الشريعة الإسلامية،منشورات كلية الدعوة الإسلامية،الطبعة الأولى:١٩٩٩م،ص:٩

(٤) سورة النساء،الآية:١٢

ثُمَّ بيّنَ ميراث الاخوة والأخوات الأبوين الأشقاء، أو الأب، فقال:﴿يَسْتَفْتُونَك قُلِ اللهُ يُفْتِيْكمْ فِي الْكلاَلَةِ إنْ امْرُؤٌ هلك لَيْسَ له ولَدٌ ولَهُ أخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَاتَرَك وهُويَرْثُهَا إن لَمْ يَكنْ لَهَا ولَدٌ فَإنْ كانَتَا اثنتَيْنِ فَلَهُمَا الثُلُثَانِ مِمَّا تَرَك وإنْ كانُوا إخوةً رِجَالاً ونِسَاءً فلِلذَّكرِ مِثْلُ حَظِّ الأُنْثَيَيْنِ يُبَيِّنُ الله لَكمْ أن تَضِلُّوا واللهُ بِكلِّ شيءٍ عَلِيْمٌ﴾(١). أما الأنثى فهي التي تأخذ المهر، وهي التي تستحق النفقة (Maintenance) عليها مهما كانت ميسرة الحال، ولا تكلف شيأً إلا صدقة وتطوعا، مما يجعل نصيبها الذي يستحقه من الميراث بمثابة ادخار لحاجات طارئه (Casual) أو اضطرار ما، مما يندر حدوثه في بيئة إسلامية حقيقية نظامًا وسلوكاً(٢). إن الشريعة الإسلامية تعطي المرأة في الميراث مثل نصيب الرجل، وأكد القرآن والسنة مبدأ المساواة بين المرأة والرجل في جميع الحقوق والواجبات فلم يضاعف من ثواب أو أجر الرجل، ويخفف من عقابه ولم يضاعف بالمقابل من عقاب المرأة ولم يخفض من ثوابها.

حقوق الزوجة على زوجها

أقرت الشريعة الإسلامية أحكامًا، هي ضمانات لحقوق المرأة الزوجية، وتعدّ هذه الضمانات أحكامًا، ملزمة من قبل الشارع، وبمثابة حدود، يحرم تجاوزها، وذلك للمحافظة على حقوق المرأة الزوجية، ولدفع الظلم عنها إذا وقع، أو وجد احتمال وقوعه، أو كان ثمة احتمال للتهاون في أدائها، سواء كان ذلك من أجنبي، أو من قِبل الزوج، أو من ولي أمرها، أو من قبِلَه هي(٣). وقد أكدت الشريعة تلك الحدود بقوله تعالى: ﴿تِلْك حُدُود اللهِ فَلا تَعْتَدُوهَا ومَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللهِ فأُولئِك هُمْ الظَّالِمُونَ﴾(٤). وقد وردت آيات وأحاديث كثيرة توجب أداء الحقوق عامة، كما تأمربأداء الحقوق الزوجية خاصة، وتعدّ بالثواب على أدائها،كما تتوعد بالعقاب من أخل بها. يثبت للزوجة بعقد الزواج الصحيح ما يعرف بالإصطلاح الشرعي المهر أو الصداق، كما يثبت لها بهذا العقد أيضا النفقة على زوجها مع العدل في معاملتها ومعاشرتها بالمعروف(٥) (As per custom)، وتفصيلها فيماياتي:

---

(١) سورة النساء،الآية:١٧٦

(٢) الدكتور عمارة نجيب،الأسرة المثلى في ضوء القرآن،ص:١٦٩

(٣) أبوداود،سنن،كتاب النكاح،باب في التقسيم بين النساء،رقم الحديث:٢١٣٣م ص:٢٤٢ بلفظ «مَنْ كَانَتْ لَهُ امْرَأَتَانِ فَمَالَ إِلَى إِحْدَاهُمَا، جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَشِقُّهُ مَائِلٌ»

(٤) سورة البقرة،الآية:٢٢٩

(٥) زيدان،عبدالكريم،المفصل في أحكام المرأة والبيت المسلم،مؤسسة الرسالة،بيروت،الطبعةالثانية:١٩٩٤م، ص:٤٨٧

المهر

يجب على الزوج أن يؤدى هذه الفريضة، والمرأة تتصرف فيه كيفما شاعت، ولا بحق لزوجها أو أهلها أن يستمتعوا بجزء منه إلا برضاها. وهو دليل بإكرام المرأة، ولم يحدد الشرعى الإسلامي قدراً معلوماً للمهر. ومن حسن رعاية الإسلام للمرأة واحترامه لها أن أعطاها حقّها في التملك، إذ كانت في الجاهلية مهضومة الحق مهيضة الجناح حتى أن وليها كان يتصرف في خالص مالها، لايدع لها فرصة التملك، ولا يمكنها من التصرف. فكان أن رفع الإسلام عنها هذا الإصر: وفرض لها المهر، وجعله حقًّا على الرجل وليس لأبيها، ولا لأقرب الناس أن يأخذ شيأً منها إلا في حال الرضا والاختيار[١] (Free consernt). وقال الله تعالى: ﴿وآتُوا النساءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً فإن طِبْنَ لَكمْ عَنْ شَىْ ءٍ مِنْهُ نَفْسًا فَكلُوهُ هَنِيْأً مَرِيْئًا﴾[٢].

وردتْ آيات متعددة تنص على النهى عن ظلم على المرأة وهضم حقوقها، منها: قول الحق تبارك وتعالى ﴿ولا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْتُمُوهُن﴾[٣]. وقال الله تعالى:﴿وإنْ أرَدْتُمْ اسْتِبْدَالَ زَوجٍ مَكان زَوجٍ وآتَيْتُمْ إحْدَاهُنَّ قِنْطَاراً فَلاَ تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْأً أتَأْخُذُونَهُ بهتاناً وإثْمًا مُبِيْنًا، وكَيْفَ تَأْخُذُونَهُ وقَدْ أفْضَى بَعْضُكمْ إلىٰ بعضٍ وأخَذْنَ مِنْكمْ مِيْثَاقًا غَلِيْظًا﴾[٤].من حق الزوجة على زوجها العدل بالتسوية بينها وبين غيرها من زوجاته، وقوله تعالى:﴿فإن خِفْتُمْ ألا تعْدِلُوا فواحِدةً﴾[٥]. وقوله تعالى:﴿فلا تَمِيْلُواكلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كالْمُعَلَّقَة" [٦]. وقوله تعالى: ﴿فَلاَ تَعْضُلُوهُنَّ أن يَنْكحْن أزْواجَهُنَّ إذا تَراضَوابَيْنَهُمْ بالمعروف﴾[٧]. ونفس النظرية جاءت بها السنة النبوية وهى تؤكد المساواة والعدالة بين زوجين ومثال ذلك قول أبي هريرة ﷺ عن النبي ﷺ قال:« إِذَا كَانَ عِنْدَ الرَّجُلِ امْرَأَتَانِ فَلَمْ يَعْدِلْ بَيْنَهُمَا جَاءَ يَوْمَ القِيَامَةِ وَشِقُّهُ سَاقِطٌ »[٨].

النفقة

يجب على الرجل أن ينفق على زوجته بالمعروف (As per custom) ، وأكدت الشريعة الإسلامية أن النفقة لازمة على الزوج على كل حالٍ، وهي حق من أكد حقوقها عليه، في لزامه توفير ما تحتاج إليه

---

(١) السيد سابق،فقه السنة،دار الكتاب العربي بيروت،الطبعة الثامنة:١٩٨٧م،١٤٢/٢

(٢) سورة النساء،الآية:٤

(٣) المصدر السابق:٢

(٤) المصدر السابق:٢٠،٢١

(٥) المصدر السابق:٣

(٦) المصدر السابق:١٢٩

(٧) سورة البقرة،الآية:٢٣٢

(٨) الترمذي،سنن،كتاب،النكاح،باب ما جاء في التسوية بين الضرائر،رقم الحديث:١١٤١،شركة مكتبة ومطبعة مصطفى البابي الحلبي،مصر،الطبعة الثانية:١٩٧٥م،٤٣٩/٣

الزوجة من طعام، ومسكن، وخدمة، ودواء، وإن كانت غنية. فقول تعالى:﴿لاَ تكلَّفُ نَفْسٌ إلاَّ وسْعَهَا لاَ تُضَارَّ والِدَةٌ بِولَدِهَا ولاَ مَولُودٌ لَه بِولَدِهِ وعَلىَ الْوارِثِ مِثْلُ ذالِك فَإنْ أرَادَا فِصَالاً عَنْ تَراضٍ مِنْهُمَا وتَشَاورٍ فَلاَ جناحَ عَلَيْهِمَا﴾[١]. وكيف يكون الأمر كذلك وفي المشورة ما بشعر المرأة بأنَّها ذات مسؤولية مشتركة، وأنّما تعيش في جو من الحياة المشتركة التي يهمها في صلاحها، ويوغر صدرها وفسادها ... وهنا تكتل جهودها في سبيل حفظها وصيانتها، كما تكثف قواها في الإشراف والرعاية لها. يقول الله تعالى:﴿أسكنُوهُنَّ مِنْ حيث سَكَنْتُمْ مِنْ وجْدِكمْ ولاَ تُضَارُّوهُنَّ لِتُضيِّقُوا عَلَيْهِنَّ وإنْ كنَّ أُولاتِ حَمْلٍ فَأَنْفِقُوا عَلَيْهِنَّ حَتَّى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾[٢]. وقوله تعالى:﴿لِيُنْفِقْ ذُوسَعَةٍ مِنْ سَعَتِهِ ومَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللهُ لاَ يُكلِّفُ اللهُ نَفْسًا إلاَّ مَا آتَا هَا سَيَجْعَلُ اللهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْراً﴾[٣]. والأحاديث النبوية طلبت من الزوج أن يؤدى النفقة ملائمة لزوجتها. وكذلك طلبت من الزوجة، في نفس الوقت، أن تستدعى النفقة من الزوج وما كان في قدرته.عن سعدِ بْنِ أبي وقاصٍ أنَّ رسولَ الله ﷺ قال:«إنَّك لَنْ تنفِقَ نفقةً تبْتَغِيْ بِهَا وجهَ الله إلاَّ أُجِرْتَ عَلَيْهَا حَتَّى مَا تجْعَلْ في فمِ امرأتِك»[٤]. يجب على أن يؤدى النفقة على أهله، ومن الآيات والأحاديث الواردة في وجوب لنفقه الزوجة على زوجها، وأن النفقه على الزوجة والأولادِ أعظم أجراً من جميع الصدقات.

عاشرة بالمعروف

إن العلاقة الزوجيه في الشريعة الإسلامية جعلها الله تعالى قائمة على المودة والعطف، ومن حسن العشرة أن يساعد الرجل زوجته في بعض شؤون البيت، ويجب على الزوج أن يحسن بها. كما قال الله تعالى:﴿وعَاْشِرُوهنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾[٥]. ويقول الله تعالى:﴿وأتمِرُوا بَيْنَكمْ بِمَعْرُوف﴾[٦].كما أوصى النبي صلى الله عليه وسلم بحسن معاملة النساء فقال لأصحابه « وَاسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا، فَإِنَّهُنَّ خُلِقْنَ مِنْ ضِلَعٍ، وَإِنَّ أَعْوَجَ شَيْءٍ فِي الضِّلَعِ أَعْلاَهُ، فَإِنْ ذَهَبْتَ تُقِيمُهُ كَسَرْتَهُ، وَإِنْ تَرَكْتَهُ لَمْ يَزَلْ أَعْوَجَ، فَاسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا »[٧]. وكرَّم الإسلام المرأة زوجة، فأوصى الزوج بحسن معاشرتها، وأخبر أن لها من الحق مثل للزوج إلا أنه يزيد عليها درجة لمسؤوليته في الإنفاق والقيام على شؤون البيت، وبيَّنَ أن خير المسلمين أفضلهم تعاملا مع زوجته، حيث يقول

---

(١) سورة البقرة،الآية:٢٣٣

(٢) سورة الطلاق،الآية:٦

(٣) المصدر السابق:٧

(٤) البخاري،الصحيح،كتاب الإيمان،باب ماجاءَ من أن الأعمال بالنيّة،رقم الحديث:٥٦

(٥) سورة النساء،الآية:١٩

(٦) سورة الطلاق،الآية:٦

(٧) البخاري،الصحيح،كِتَابُ النِّكَاحِ بَابُ الوَصَاةِ بِالنِّسَاءِ،باب الوصاة بالنساء،رقم الحديث:٥١٨٦

الرسول الله ﷺ: «خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لأهله وأنَا خَيْرٌ لِأَهْلِي»[١]. وفي هذا الحديث دليل عظيم على محاسن الإسلام التي جاء بها، ومن جملتها أنه جعل الإحسان إلى الزوجة والعيال من أفضل الأعمال والقربات لقد كان رسول الله ﷺ أحسن الناس عشرة لهم، وكان على خلق عظيم. لقول الشوكاني رحمه الله عندما شرح الحديث: "وذلك تنبيه على أعلى الناس رتبة في الخير، وأحقهم بالإنصاف به هو من كان خير الناس لأهله، فإن الأهل هم الأحق بالبشر، وحسن الخلق، والإحسان، وجلب النفع، ودفع الضر، فإذا كان الرجل كذلك فهو خير الناس، وإن كان على العكس من ذلك فهو في الجانب الآخر من الشر"[٢].

لقد أعطى الإسلام حق اختيار الزوج، وحق التملّك (Right of ownership)، وحق الاستقلال بما لها، والتصرف فيه وحق العمل والخروج من البيت لعبادة، والسعي على الرزق، وفرض عليها أن تتعلم وتتثقَّفَ، وجعلها ربَّة الأسرة، وسيدها المدبّرة لأمرها المنظّمة لشؤونها. وللمرأة دور ومقام مرموق (Eminent) في المجتمع الإسلامي، ولا فرق بين الرجل والمرأة في الخطاب الإلهي قال الله تعالى:﴿أَنِّيْ لَاأُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِنْكُمْ مِنْ ذَكَرٍ أَوأُنْثَى بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ﴾[٣]. لقد كرّم الإسلام المرأة تكريما عظيماً، كرّمها باعتبارها أُماً يجب برَّها وطاعتها، والإحسان إليها. وحَرّم عقوقها واغضابها، وأخبر أن الجنّة عند قدميها، وجعل رضاها من رضا الله تعالى، وجعل حقها أعظم من حق الوالد.

واجبات المرأة في الشريعة الإسلامية

قد أعطى الله سبحانه وتعالى للرجل والمرأة منزلة متساوية، ولكن وظيفتهم مختلفه بعضها عن البعض، فالمرأة هي العنصر الأساسي (Basic Element) في تشكيل الأسرة والمجتمع، وهي أن تتزوج، وتحمل، وتلد، وتربي، وتقديم بشؤون البيت محتمية بظل الرجل الذي جعل الله له القوامة عليها يقول الله تعالى:﴿ولاتَتَمَنَّوا مَافَضَّلَ اللهُ به بعضكمْ عَلىٰ بعضٍ لِلرَّجَالِ نصيبٌ مِمَّااكتَسَبُوا ولِلنِّسَاءِ نَصِيْبٌ مِمَّا اكتَسَبْنَ واسْأَلُوا اللهَ مِنْ فَضْلِهِ إنَّ اللهَ كانَ بِكلِّ شَيْءٍ عَلِيْماً﴾[٤]. والفقرات التالية ستشرح الموضوع مواضحاً ومد للاً ومفضلاً.

الواجبات بنسبة حقوق الله تعالى

المرأة المومنة المكلّفة عن دينها الإسلام، من حيث النفقه والتعليم في دين الله. والعمل والدعوة الإسلام، وتربية الأولاد، وحثّ الأبناء على الجهاد في سبيل الله، ونشر الخير، والسلام، والمحافظة التامة على

---

(١) الترمذي،سنن،أبواب المناقب،باب في فضل أزواج النبي ﷺ،رقم الحديث: ٣٨٩٥

(٢) النهر الجديد (أخبار يومية وطنية) (٢٩١٩١٢٠١٥)، تصدر من الجزائر

(٣) سورة آل عمران،الآية:١٩٥

(٤) سورة النساء،الآية:٢٢

الصلوت الخمس بأدائها في أوقاتها، كما قال رسول الله ﷺ:«المرأة راعيه على بيت زوجها وهي مسؤلة»[١] ولعموم العبادة لأنها خلقت لعبادة الله وتعبدها الله كما قال رسولُ الله ﷺ: «إذا صلّت المرأة خمسها، وصامت شهرها، وحفظت فرجها وأطاعت زوجها قيل لها أُدخلي الجنه من أي أبواب الجنةشئت»[٢]. الله سبحانه وتعالى حق علينا، أن نعبده؛ لأنه خلقنا ﴿ياأيّها النّاس اعْبُدُوا رَبَّكم الَّذى خَلَقَكمْ﴾[٣]. إن أول وأعظم الحقوق هو حق الله تعالى، وأعظم واجب على المرأة المؤمِنَة أن تعبد الله ولا تشرك به شيئاً. كما قال الله تعالى: ﴿اُعْبُدُوا اللهَ ولَاتُشْرِكوبِه شيْئًا﴾[٤]. فقد أشار القرآن لبني آدم في مواقع عديدة، وإلى الرجال والنساء معًا منها في الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر قال الله سبحانه وتعالى:﴿ وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴾[٥].

الحجاب

الحجاب هو لباس يستر جسد المرأة، وهو أحد الفروض الوجبة على المرأة في الشريعة الإسلامية، فقد لقيت المرأة المؤمنه من التشريع الإسلامي عناية فائقة (Prime)، ومكانة مرقومة، وإن القيود التي فرضت عليها في ملبسها وزينتها لم تكن إلا لسد أسباب الفساد. وذلك كي يظل المجتمع نقيا سليمًا، وتبقى النفوس طاهرة من نوازع الشر والفتنة، فأمر سبحانه وتعالى النساء أن يخفين زينتهن وحسنهن ونها هن عن التبرج والسفور[٦]. قال تعالى: ﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَآتِينَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا﴾[٧]. وقوله تعالى:﴿واذا سَألْتُمُوهُنَّ متاعًا فَاسْألُوهُنَّ مِنْ ورَا ءِ حِجَابٍ ذَلِكمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكمْ وقُلُوبِهِنَّ﴾[٨].

ليس معنى ذلك أن ترفع المرأة صوتها بالغلظة والخشونة، وانّما يجب أن يكون صوتها الطبيعي في المخاطبة المعتدل الخالي من التكسر، والاغراء، وتكون جادة في كلامها متزنة الشخصية وبذلك تحظى باحترام المجتمع

(١) أحمد بن حنبل،مسند،٤/٢٨٣
(٢) المصدر السابق،رقم الحديث:١٤٤١
(٣) سورة البقرة،الآية:٢١
(٤) سورة النساء،الآية:٣٦
(٥) سورة التوبة،الآية:٧١
(٦) دكتور مكيّه مرزا،مشكلات المرأة المسلمة المعاصرة،ص:٢٥٤
(٧) سورة الأحزاب،الآية:٣٣
(٨) المصدر السابق:٥٣

وبالأجر العظيم من الله[١]. وقوله تعالى: ﴿يا أيّها النَّبيُّ قُلْ لِأَزْواجِك وبَناتِك ونِساءِ المؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلاَبِيْبِهِنَّ ذَلِك أدْنَى أنْ يُعْرَفْنَ فَلاَ يُؤْ ذَيْنَ وكانَ اللهُ غَفُوراً رَحِيْمًا﴾[٢]. وفي هٰذه الآية التصريح بوجوب ستر الزينة كلها وعدم إظهار لشيئ منها أمام الأجانب إلا ما ظهر بغير قصد منهن، فلا يؤاخذن عليه إذا بادرن إلىٰ ستره[٣]. وقوله تعالى:﴿ يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِنَ النِّسَاءِ إِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقُلْنَ قَوْلًا مَعْرُوفًا﴾[٤]. وهناك أحاديث متعددة تدل على فرضية الجاب منها. أنَّ عَائشة رَضِي الله عَنْهَا كانَتْ تقولُ: «لَمَّا نَزَلَتْ هٰذِه الْاٰيَةُ ﴿ولْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِ هِنَّ عَلىٰ جُيُوبِهِنَّ﴾ أخَذَنَ أزَا رَهُنَّ فَشَقَقْنَهَا مِنْ قِبَلِ الحَوا شِيْ فَاخْتَمَرْنَ بِهَا». فالحجاب وسيلة للحماية يَّسرت للمرأة الخروج، والمشاركة الفعّالة في بناء المجتمع، وخدمة الأمة، وهو وقاية لها أن تسقط في درك المهانة.

غضّ البصر

غض البصر أن يغمض المسلم نظره عما حرم عليه، فالذى يغض البصر عن الحرام يجدُ نوراً وقوة في قلبه، وحياءً، وراحة للنفس والبدن. لأن النظرة هي أكبر خائته نفسية، وهي سَهْمٌ من سهام إبليس المسمومة، وهي نافذة القلب ويريده، لذا ورد الأمر في القرآن والسنة بغضّ النظر[٥]. فهو في قوله تعالى: ﴿قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوا مِنْ أبْصَارِ هِمْ ويَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ ذَلِك أزْكى لَهُمْ إنَّ اللهَ خَبِيْرٌ بِمَايَصْنَعُون، وقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أبْصَارِ هِنَّ ويَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ﴾[٦]. وهذا أمر الله سبحانه وتعالى عام للرجال والنساء بغضِّ الأبصار عمّا حرّم الله تعالى عليهم، أن في غض البصر شكراً لله تعالى على نعمة البصر، كما قال الله تعالى:﴿والله أخرجَكمْ من بطونِ أمَّهَا تِكمْ لا تَعْلَمُونَ شيأً وجَعَلَ لَكمْ السَّمْعَ والأبصَارَ والأفْئدَةِ لعلكم تشكرُونَ﴾[٧]. نعمة البصر نعمة عظيمة من الله تعالى، وشكر هذه النعمة من أوجب الواجبات على النساء والرّجال: وسوف نسأل عمّا رأينا بأبْصارنا قال الله تعالى:﴿انَّ السَّمْعَ والْبَصَرَ والْفُؤا دَ كلُّ أولئك كانَ عَنْهُ مَسْؤُولاً﴾[٨]. وعن ابنِ عباس ﷺ قال:«كان الفَضْلُ رَدِيفَ النبيّ صلى الله عليه وسلم، فجاءت امرأةٌ من خثعَمَ، فجعلَ الفضلُ يَنْظُرُ إليهَا وتَنْظُرُ إليه، فجعل النبيّ ﷺ يصْرِفُ وجهَ

(١) دكتور مكيّه مرزا،مشكلات المرأة المسلمة المعاصرة،ص:٣٥٥
(٢) سورة الأحزاب،الآية:٥٩
(٣) الألباني،محمّد ناصر الدين، جلباب،دار السلام،٢٠٠٢م،ص:٤٠
(٤) سورة الأحزاب،الآية: ٢ ٣
(٥) دكتور مكيّه مرزا،مشكلات المرأة المعاصرة،ص:٣٥٤
(٦) سورة النور،الآية:٣٠،٣١
(٧) سورة النحل،الآية:٧٨
(٨) سورة بني إسرائيل،الآية:٣٦

الفضلِ إلى الشِّقّ الآخر، ، فقالَتْ: إنّ فريضَةَ الله على عباده الحّج، أدركتْ أبي شيخاً كبيراً لايثبُتُ على الرَّاحِلةِ، أفأ حُجُّ عنه؟ قالَ: "نعم" وذلك في حَجَّةِ الوداعِ»[١].

الواجبات بنسبة حقوق الوالدين

لاريب أن طاعة الوالدين من أهم الفرائض، ومن أعظم الواجبات، وتقديم طاعتهما على طاعة كلّ البشر، كما قال الله تعالى:﴿وقَضَى رَبُّك أنْ لاَّ تَعْبُدُوا إلاَّ إيَّاه وبِالْوالِدَيْنِ إحْسَاناً إمَّا يَبْلُغُنَّ عِنْدَك الْكبَرَ أَحَدُهُمَا أَوكَلّا هُمَّا فَلاَ تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ ولَا تَنْهَرْ هُمَا وقُلْ لَهُمَا قَولاً كرِيْماً واخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذَّلِّ مِّن الرَّحْمَةِ وقُلْ رَبِّيْ ارْحَمْهُمَا كمَا رَبَّيَانِيْ صَغِيْراً﴾[٢]. إن طاعة الوالدين وبرّهما واحترامهما سبب دخول الجنّة، وهي واجب على كلّ مسلم ومسلمةٍ، قال الله تعالى سبحانه:﴿وإِذْ أَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيْلَ لاَتَعْبُدُونَ إلاَّ الله وبِالْوالِدَيْنِ إحْسَاناً﴾[٣]. وقال تعالى:﴿واعْبُدُواالله ولَا تُشْرِكوابه شَيْأً وبِالْوالِدَايْنِ إحْسَاناً﴾[٤]. وقال الله سبحانه تعالى:﴿ووصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوالِدَيهِ، حَمَلَتْه أمُّه وهْناً عَلىٰ وهْنٍ وفِصَالُهُ فِيْ عَامَيْنِ أنِ اشْكرْلِى والِدَيْك إلىَّ الْمَصِيْرُ﴾[٥]. حين أمر سبحانه بشكر الوالدين قدّم شكره تعالى على شكرهما فقال:﴿أَنَ اشْكرْلِيْ ولِوالِدَيْك﴾ وفي هذا التقديم إشارة إلى أن حق الله أعظم من حق الوالدين، وشكره أوجب وألزم، لأنه تعالى هم المنعم الحقيقى، المتفضل على عبادة بالنعم، وشكر الوالدين جزء من شكر المنعم، والله جلّ وعلا هو السبب الحقيقي في الخلق والايجاد، والوالدانِ السبب الظاهرى فينبغي أن يقدم السبب الحقيقي على السبب الظاهري[٦]. كما قال الله تعالى:﴿وإِنْ جَاهَدَاك عَلى أنْ تُشْرِكَ بِيْ مَالَيْسَ لَك بِه عِلْمٌ فَلاَ تُطِعْهُمَا﴾[٧]. فكما تحرم طاعة الوالدين في الشرك تحرم في كلّ معصيّة، لأنه لا طاعة المخلوق في معصية الخالق[٨]. فالإحسان إليهما واجب، وطاعتهما في معصية الله ممنوعة[٩]، وقوله:﴿وصَاْحِبْهُمَا في

---

(١) البخاري،الصحيح،كتاب الحج، بَابُ حَجِّ المرْأَةِ عَنِ الرَّجُلِ ،رقم الحديث: ١٨٥٥
(٢) سورة بني إسرائيل،الآية:٣٦
(٣) سورة البقرة،الآية:٨٣
(٤) سورة النساء،الآية:٣٦
(٥) سورة لقمان،آية:١٤
(٦) الصابوني،محمّد علي،تفسير آيات الأحكام من القرآن ،مؤسسة مناهل الفرقان،الطبعة الثالثة:١٩٨١م، ٢٤١/٢
(٧) سورة لقمان،الآية:١٥
(٨) محمّد علي الصابوني،تفسير آيات الأحكام من القرآن،٢٤٦/٢
(٩) المصدر السابق:٢٣٩/٢

الدُّنيا مَعْرُوفاً﴾[١]. ويجب على المرأة المسلمة في إكرام والديها، فإنهما، يستحقان ببرها وطاعتها في غير معصية الله، وكفّ الأذى عنهما سواء كأن قولاً أوفعلا.

الواجبات بنسبة حقوق الزوج

آثار عقد الزواج لاتقتصر على ترتيب حقوق للزوجة على زوجها، بل ترتب أيضا حقوقا للزوج على زوجته، وحقوق الزوج كما سنرى أعظم وأكّد من حقوق الزوجة، وجملة حقوق الزوج تتلخص في قوامته عليها، ووجوب طاعته، وحسن معاشرة، وحقه في تأديبها إذا خرجت عن طاعته، كما أن له حقوقاً أخرى تتعلق بالبيت، مثل في أن تقرّ في بيت الزوج فلا تخرج إلا لحاجة[٢].

أ.تعظيم الزوج والزوجة وحق فهم من حقوق الزواج.

قال تعالى:﴿ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عليهنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عليهنَّ دَرَجَةٌ واللهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾[٣].

فإن زيادة الدرجة للرجل على زوجته تقتضى التفضيل وتشعر أن حقّ الزوج. عليها أوجب من حقّها عليه[٤]. وهي في ما أمر تعالى به من القوامة والإنفاق، والإمرة، ووجوب الطاعة فهي درجة تكليف لا تشريف[٥]. لقوله تعالى:﴿إِنَّ أَكرَمَكُمْ عِنْدَالله أَتْقَاكمْ﴾[٦]. وفي حديث لرسول الله ﷺ:«لوكنتُ آمراً أحداً أن يسجد لأحد لأمرتُ النساءَ أن يَسْجُدْنَ لأزواجهنَّ لما جعل الله لهم عليهنَّ من الحق»[٧]. يجب على الزوجة طاعة زوجها، وتخدمه المعروفة، وتعظمة بين الناس، لأن التعظيم هووقود الحياة الزوجية السعيدة.

ب. إطاعة الزوج

جعل الله الرجل قواماً على الزوجه، وهو رب الأسرة، فأمَرَ الشرع للمرأة أن تطيع زوجها، قال الله تعالى:﴿فَالصَّالِحَاتٌ قَانِتَاتٌ﴾[٨]. وقد جاءَ تفسير هذِه الآية: أنّ عليها أي على الزوجة طاعته، وقبول أمره أي طاعَة الزوج، وقبول أمره مالم تكن معصية[٩]. والرسول ﷺ في حياته مع زوجاته كان خير قدوة للرجال والنساء فإنه ﷺ كان دقيق الملاحظة والتحري، رقيق الوجدان والمشاعر، والدليل على ذلك قوله لعَائشة

---

(١) سورة لقمان،الآية:١٥

(٢) زيدان،عبدالكريم،المفصل في أحكام المرأة والبيت المسلم،مؤسسه الرسالة،بيروت،الطبعة الثانية:١٩٩٤م،٢٧٢/٧

(٣) سورة البقرة،الآية:٢٢٨

(٤) القرطبي،أحكام القرآن،٦٢٥/٣

(٥) مُحَمَّد علي الصابوني،تفسير آيات الأحكام من القرآن،١٤٦/١

(٦) سورة الحجرات،الآية:١٣

(٧) سنن أبي داوود مع حاشية عون المعبود، كتاب النكاح،باب في حق الزوج على المرأة،دارالكتاب العربي،بيروت لبنان،٢١٠/٢

(٨) سورة النساء،الآية:٣٤

(٩) القرطبي،أحكام القرآن،١٦٩/٥

زوجته ﷺ[١]،«إني لأعلم إذا كنت عني راضية وإذا كنت علي غضبي. قالت فقلت: من أين تعرف ذلك؟ أما إذاكنت عني راضية فإنّك تقولين: لاوربّ مُحَمَّد، وإذا كنتِ غضبي قلت: لاوربّ إبراهيم. قالت: فقلت: أجل والله يارسول الله ما أهجر إلا اسمك»[٢].

د. حفظ مال الزوج

ومن حق الزوج على زوجته أن تحفظ ماله ولا تبذره، أو تتصرف فيه بدون وجه حقّ، وهذا هو حقّه الثالث كما جاء عنه قوله تعالى:﴿حَافِظَاتٌ لِلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللهُ﴾[٣]. قال قتاده في تفسير الآية: "مطيعات لله ولأزواجهن: وأصل القنوت من مداومة الطاعة لحافظات للغيب" أي حافظات لما غاب عنه أزواجهن من ماله، وما يجب من رعاية حاله وما يلزم من صيانة نفسها له[٤]. وقوله تعالى:﴿بِمَا حَفِظَ اللهُ﴾ أي عليهن أن يحفظن حقوق الزوج في مقابلة ما حفظ الله حقوقهن على أزواجهن. حيث أمرهم بالعدل عليْهنَّ وإمساكهن بالمعروف وإعطاهن مهورهن[٥]. قال رسول الله ﷺ:«كلكم راعٍ وكلكم مسؤول عن رعيته، والمرأة راعية في بيت زوجها ومسؤولة عن رعيتها، والخادم راعٍ في مال سيدة ومسؤول عن رعيته، كلكم راع ومسؤول عن رعيته»[٦].

هـ. قرار الزوجة في البيت

وإذا كان القرار في البيت أمراً عاماً لجميع النساء، وأنه هو الأصل في علامة المرأة بالبيت فإن هذا الأمر يتأكد ويتحتم بالنسبة للزوجة لحق الزوج في هذا القرار في البيت[٧]. ولأن الآية الكريمة:﴿وقَرْنَ في بُيُوتِكنَّ﴾[٨]. في سياق هذا الخطاب مع آيات أخرى تخص الزوجات صراحة، وتدّل على هذا الأصل وهو قرار الزوجة البيت ومن هذه الآيات قوله تعالى: ﴿أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سكنتم من وجْدِكمْ...﴾[٩]. والأمر بالإسكان نهى عن الخروج والبروز والإخراج؛ لأن الأمر بالفعل نهى عن ضده، وهذا يعني لزوم قرار الزوجة في

(١) دكتور مكيّه مرزا،مشكلات المرأة المسلمة المعاصرة،ص:٤١٢
(٢) البخاري،الصحيح، كتاب النكاح،باب غيرة النساء ووجدهن،٤٧/٧
(٣) سورة النساء،الآية:٣٤
(٤) الرازى،أبو بكر أحمد بن علي،أحكام القرآن ،دارالكتب العربي،بيروت،١٨٨/٢
(٥) الرازى،فخرالدين،تفسير الكبير،دارالفكر،بيروت،١٩٧٨م،٢١٦/٣
(٦) البخاري،الصحيح، كتاب النكاح،باب المرأة رعية فيبت زوجها،٤١/٧
(٧) عبدالكريم زيدان،المفصل في أحكام المرأة والبيت المسلم،٢٨٩/٧
(٨) سورة الأحزاب،الآية:٣٣
(٩) سورة الطلاق،الآية:٦

البيت[١]. وألا يعقوقها عن أداء واجبات الزوجيه والأولاد، وألا يكلفها إهداء خصائص جنسها، وألا تخرج في زيها، وزينتها وستر أعضاء جسمها عما سنته الشريعة الإسلامية، وألا تختلط بالرجال ما أمكن، وأن يكون معها من يحميها من المحارم إذا اضطرت إلى مخالطة الرجال[٢]. فالشرع حثّ النساء على القرار في البيتِ، وإنّما المكروه خروجهن من غير حاجة بدون إذن زوجهنَّ، أمَّا إذا كان خروجهن للدعوة، أو للتعلم أو لزيارة الأهل والأباء فلا يجور للزوج أن يمنعها وقول الله تعالى:﴿ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى ﴾. أى: لا تكثرن الخروج متجملات أومتطيبات كعادة أهل الجاهلية والأمر بالقرار في البيوت حجاب لهنّ، فاذا يخرجْنَ من البيوت، وجب عليهنّ الحجاب.

الخاتمة

فإن مكانة المرأة في العصر الجاهلي دون مكانة الرجل بكثير، والعرب تحب الذكور، لأنهم جنود القبيله ورجالها الحماة، أما المرأة لا تغني في الحرب شيأً، بل تكون عَبَئًا على القبيله، لأنها مقصد الأعداء يريدونها سبيه وسبى المرأة عنهم عار لايسكت عنه، ولم يكن للمرأه نصيب في الميراث أيام الجاهليه، بل إنَّ الرجل كان إذا بشَّره أهله ببنتٍ اسودَّ وجهه من قول الله تعالى يصف حاله: ﴿وإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِالْأُنْثى ظَلَّ وجْهَه مُسْوَدّاً وهُوكظِيْمٌ، يَتَوارَى مِنَ الْقَومِ مِنْ سُوءِ مَا بُشِّرَبه أَيُمْسِكه عَلى هُونٍ أَمْ يَدُسُّه فِيْ التُّرَابِ، أَلَا سَاءَ مَا يَحْكمُونَ﴾. كما جاء الإسلام كذلك ناصراً للمرأة في كل أحوالها فقد كرَّمها أُمّاً، وكرَّمَهَا بنتاً، وأختا، وكرَّمها زوجة، وحَرَّمَ وأدها. وقد جاء الإسلام فأكرم المرأة أمة وحرةً، فدعا إلى العناية بها، والعطف عليها فحرم إن تفضل وتمتع من الزواج كما حرّم أنواعا شائنة من الزواج كانت عندالجاهلين. وفرض الله سبحانه وتعالى حقوق المرأة كاملة غير منقوصة، ويجعلها عنصراً فعالا في نهوض المجتمات، وأن المرأة كالرجل في الإنسانية سواء بسواء كما قال الله سبحانه وتعالى:﴿ إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا﴾. وأنَّ الإسلام يخاطب الرجال والنساء على السواء ويعاملهم بطريقه حسنة ومتساوية. وأخبر هم مغفره وأجراً عظيماً. وأن الإسلام أعطى المرأة حقوقاً وفرض عليها واجبات. يجب عليها مراعاتها عند ما تطالب بأي حق يمكن أن يتناسب مع مافرضه عليها الإسلام، ومن الواجبات الأهم للمرأة في الحياة. هي الزوجية والأمومة، وما عدا ذلك من واجبات فهي ثانوية بالنسبة لمرأة، تؤديها حسب إمكاناتها وطاقتها، شرط أن تكون هذه الأعمال موافقة

(١) عبدالكريم زيدان،المفصل في أحكام المرأة والبيت المسلم،٢٨٩/٧

(٢) الدكتور عمارة نجيب،الأسرة المثلى في ضوء القرآن والسنة،ص: ١٠٥

لطبيعتها الأنثوية، غير مؤثرة على رسالتها الأساسية، ولا تؤدى بها إلى الفتنة والفساد. وأن الشريعة الإسلامية تعطى المرأة حقوقاً كاملاً، حين قرر للمرأة حقوقها دون ثورة النساء بينما لم تحصل المرأة القرنسية على حقوقها إلا بعد ثورات، ولكن الإسلام أعطى لها حقوقاً دفعةً واحدةً. والآن فالواجب على كل امرأة مؤمنة تؤمن بالله واليوم الاخر في الدور الحاضر، أن لا تتأثر بالمرأة المغربيية، ولا بأقوال أتباع المغربين، بل تتبع أحكام الإسلام، وتأخذ جانب الخير فتعمل به، وتتجنب الشر، وتأخذ من الأعمال الصالحة والصفات المحمودة، ليرجع عليها بالنعمة الروحية والمعنوية.

❁ ❁ ❁

الصحوة الإسلامية في صور فنية لدى إقبال

Islamic Renaissance in the Context of Iqbal's Poetry

د.أخلاق أحمد *

د.سميع الله زبيري *

ABSTRACT

There is no doubt that the term artistic image is one of the most technical terms used in the literary works and the study of poetic texts, because it is the effective means to show the poetic experiences with all the thoughts, feelings, and to reveal the influence and inspirations of words. On the authenticity of the poetic experience, and to prove the ability of the poet to form in a format that brings pleasure and experience to those who receive it. It grows and crystallizes within the poet with the poetic text itself, as represented in highlighting the delicate meanings and emotions of the troubled, and the serious thoughts through the technical composition of the spatial words through fluent speech, and strong expressions that raised by the internal presence rhythm and influence.

The artistic image is to achieve literary pleasure and intellectual pleasure through the artistic repertoire such as metaphor, borrowing and related rhetorical tools or through the words that lead to scenes and create expressive scenes, because they convey psychological experiences in paintings or emotional situations in scenes animating or moving, and make the static nature visible.

The researcher tried to explore the artistic value of some of these images in which the poet responded to the spirituality and Islamic awakening, which seeks to remove the ambiguity and inertia of his poetry, avoid monotonous boring repetition, and explore his skill in drawing paintings and his brilliant imagination and his noble vision and noble passion.

Keywords: *Iqbal, Rennisain, Artistic Image, Depiction.*

* أستاذمساعد في قسم اللغة العربية،الجامعة الإسلامية العالمية،إسلام آباد

* أستاذمساعد في قسم اللغة العربية،جامعة العلامة إقبال المفتوحة،إسلام آباد

ملخص البحث

لا شك أن مصطلح الصورة الفنية من أكثر المصطلحات الفنية تداولاً في الأعمال الأدبية ودراسة النصوص الشعرية، لأنها الوسيلة الفعالة القادرة على إظهار التجارب الشعورية بكل ما تحويه من أفكار وخواطر ومشاعر وأحاسيس[١]،والكشف عن طاقات الكلمات وإيحاءاتها،وهي تعدّ إحدى المعايير الهامة في الحكم على أصالة التجربة الشعرية، وإثبات قدرة الشاعر على تشكيلها في نسق يحقق المتعة والخبرة لمن يتلقاه[٢].فإنها تنمو وتتبلور في داخل الشاعر مع النص الشعري عينه، كما تتمثل في إبراز المعاني الدقيقة والعواطف المضطربة، والخواطر الجياشة عن طريق التشكيل الفنى الموحي عبر الكلمات الفصيحة الناطقة، والتعبيرات القوية المتراصة التي تثير بها الوجدان الداخلي إيقاعاً وتأثيراً.

وتقوم الصورة الفنية على تحقيق المتعة الأدبية واللذة الذهنية عن طريق الروافد الفنية كالتشبيه والاستعارة وما يتصل بهما من أدوات بلاغية أو عن طريق الكلمات التي توحى إلى مشاهد وتخلق مناظر ناطقة، وذلك أنها تنقل التجارب النفسية في لوحات فنية أو الأحوال الوجدانية في المشاهد الموحية أو المناظر المتحركة، وتجعل الطبيعة الجامدة مجسمة مرئية.

فالباحث يحاول في هذا المبحث استجلاء القيمة الفنية لبعض هذه الصور التي تصدى فيها الشاعر للنزعة الروحانية والصحوة الإسلامية كما يسعى بها إلى إزالة الغموض والجمود عن شعره، وتلافي التكرار الممل الرتيب،واستكشاف مدى مهارته في رسم لوحات فنية والإحاطة بخياله المتألق الظريف، ورؤيته السامية وعاطفته النبيلة.

المدخل

هذه الدراسة تتعرض للنزعة الروحانية التي تتمثل في الصور الفنية الرائعة في شعر إقبال، وقد هدف الباحث– عرض وتحليل– ما يتيسر له من الصور الفنية المبتدعة التي ابتكرها العلامة مُحَمَّد إقبال بمهارته الفنية وقدرته المتميزة وقوة ملاحظاته الدقيقة.

اعتمد الشاعر في انطلاقه من مضمون فكري ظاهر في صريح العبارة على قوة التصوير الفنى المحكم حيث لا يخلو– الشعر لديه – في أي حال من الأحوال من نفحة شعرية، وشعورية، وعاطفة فردية، وشعبية اجتماعية ثم عالمية، فالفكر ينطلق عبر الكلمات الناطقة والتراكيب الموحية التي تؤسس

(١) الدكتور رائد وليد جرادات،بنية الصورة الفنية في النص الشعري الحديث (الحر):نازك الملائكة أنموذجا،مجلة جامعة دمشق،العدد:١–٢، ٢٠١٣،٢٩/٥٥٢

(٢) الدكتور جابر عصفور،الصورة الفنية في التراث النقدي والبلاغي عند العرب،الدار البيضاء،لبنان،الطبعة الثالثة:١٩٩٢م،ص:٨

على أسس فنية بارعة لتحقق في الشعر روحاً تستهوى القلوب والأفئدة، لذلك نجد أن التمثيل ينطلق من الحركة التشخيصية التي يكتفي بها لإنتاج لوحات فنية طريفة، ولإعداد مشاهد فنية رائعة، بينما نجد– على الجملة –أن الشعر لا ينطلق إلا من مضمون فكري دقيق في أغراض مختلفة كما أنه لا يسمو إلى درجة الفن المتميز إلا بما يتجاوزه هذا المضمون من قوة التصوير الفني، وإبداع لوحات فنية دقيقة، اعتمادًا على إمكانيات الأداء وآليات البلاغة وأدوات الكلام حيث تبدو الصور ناطقةً والمشاهد ماثلة، والمناظر مرسومةً، والمواقف معروضةً، لذلك كان لزاماً على الباحث أن يعتنى بدراسة الصور الفنية المبتكرة لديه بعناصرها المختلفة، وأسرار تراكيبها المتناسقة، وأساليب تحليلها المتقنة، داعما بحثه بنماذج وأمثلة يكشف من خلالها مدى قدرته الفنية، وإمكانياتها التصويرية، ويستجلى من خلالها ثقافته الواسعة، وحضارتها الأصيلة، متطلعاً إلى معرفة مدى استعانته بالفنون الشعرية، والروافد البلاغية، والأدوات اللغوية، وبالتالي يقف على القيمة الفكرية والجمالية، وما يتسم به شعره من خصائص شعرية وشعورية.

التعريف بالشاعر

ولد مُحَمَّد إقبال بمدينة سيالكوت في باكستان الحالية،[١](١٨٧٧م)[٢] وفيها تلقى تعليمًا ابتدائياً ومتوسطاً، وقد أخذ العلم عن شيخه مير حسن حيث أتقن اللغة الفارسية والعربية فضلا عن الأردية، ثم التحق بالكلية الحكومية بجامعة بنجاب بلاهور وتخرج فيها، وقد حصل على شهادة الماجستير في الفلسفة، ثم سافر إلى لندن حيث التحق بجامعة "كامبرج" ونال شهادة عالية في الفلسفة، ثم الدكتواره من جامعة ميونخ في ألمانيا، وفي ٢١ أبريل سنة١٩٣٨م لفظ أنفاسه الأخيرة في حجر خادمه المخلص[٣]، ولبت روحه نداء ربها نداء مقضيا، وغربت هذه الشمس التي ملأت القلوب حرارةً ونوراً، وعلا الضجيج وكثر النشيج على موت هذا الشاعر العظيم، ودوت الأصوات في رثائه حزناً وألماً[٤].

يُعد إقبال شاعرا إسلاميا عالمياً وداعية كبيراً، قد وسع المجال في شعره إلى أغراض وفنون تتطلع إلى موضوعات إسلامية فضلا عن الأغراض التقليدية كالغزل والفخر والهجاء والرثاء وما إلى ذلك، وهو أول من

---

(١) ڈاکٹر شگفتہ زکریا، فکر و فنِ اقبال، سنگت پبلیشرز، لاہور، طبع اول: ۲۰۰۴ء، ص:۰۷

(٢) لا نستطيع أن نحدد تاريخ ميلاده تحديدا واضحا، ولذلك كثرت الأقوال في هذا الصدد، ويرجع تاريخ ولادته ما يتراوح بين ١٨٧٢–٧٧، ولكن جمهور المؤرخين والكتاب أجمعوا على تاريخ ولادته ١٨٧٧م، انظر: الدكتور سليم اختر، الدكتور أكبر حيدري كشميري،علامة إقبال حياته وفنه وفكره ترتيب، مقالة: تاريخ ولادة إقبال، سنك ميل بيليشرز،باكستان،الطبعة الأولى:٢٠٠٢ء،ص:٧٦

(٣) ڈاکٹر شگفتہ زکریا، فکر و فنِ اقبال، ص:۱۳

(٤) أبو الحسن علي الحسيني الندوي، روائع إقبال،مجلس نشريات إسلامية، كراتشي،الطبعة الرابعة:١٩٨٣م، ص:٦٨

وقف على فلسفة الذات والوجود ومعرفة الوجدان في الشعر الأردي، واتخذ لهذه الموضوعات أسلوباً رائعاً يجمع بين جزالة اللفظ وعذوبة المعنى في الصور الفنية الجميلة التي تخلع عن الشعر الجمود والتحجر والتكرار، ويغنى الأدب الأردي بصور فنية جميلة مبتكرة حيث أبقى مائدة حافلة لمن أتى بعده، فإذا الشعراء – على مرّ العصور– يقصدون معينه عن قصد أو غير قصد مبسطين أفكاره ومستلهمين نزعاته في انتاجاتهم.

لقد وعى إقبال في شعره القيم الإسلامية والمثل العليا، مما جلعه من أمراء الشعراء الإسلامين الذين نشأوا في شبه القارة الهندية، حيث شاعت في شعره المعاني الإسلامية الدقيقة، والأفكار العميقة النبيلة، والآراء الفلسفية التي تنسجم مع روح القرآن الكريم وانطلاقاته، كما ذهب إلى ذلك السيد أبو الحسن على الحسيني الندوي في كتابه روائع إقبال قائلا: "إن أعظم ما حملني على الإعجاب بشعره هو: الطموح والحب، والإيمان، وقد تجلى هذا المزيج الجميل في شعره وفي رسالته أعظم مما تجلى في شعر معاصريه، ورأيت نفسي قد طبعت على الطموح والحب والإيمان وهي تندفع اندفاعا قويا إلى كل أدب ورسالة يبعثان الطموح، وسمو النفس، وبعد النظر، والحرص على سيادة الإسلام، وتسخير هذا الكون لصالحه، والسيطرة على النفس والآفاق، ويغذيان الحب والعاطفة ويبعثان الإيمان بالله، والإيمان بمحمد ﷺ وبعبقرية سيرته، وخلود رسالته، وعموم إمامته للأجيال البشرية كلها"[١].

شخصيته وثقافته

ثمة عوامل مختلفة، وعناصر متعددة التقت واجتمعت متآزرة على تكوين شخصيته الفذة، ولا شك أنها مدرسة في ذاتها، فلسفية في أفكارها، فنية في أسلوبها شكلاً ومعنى، وقد استرعت بعظمتها المتميزة، وثقافتها الواسعة، وعلمها الغزير انتباه الجميع شرقاً وغرباً، ولا تزال حتى اليوم بفضل الشعر الذي تجلت فيه عبقريته الخصبة المنتجة، وتهيأت لها من الثقافات، والمؤثرات الخارجية غذاء ملائماً، أسهم خير إسهام في إنمائها، وإنضاجها، وإبرازها في سعة مداها، ومن أهم هذه العوامل ما يلي:

مما لا ريب فيه أنه قد أوتي – منذ صغر سنه– عقلا قويا سمحا، لا يضيق على نفسه في دقائق الأمور، كما أنه وهب ذاكرة قوية خارقة، مما أهلاه عن وعي لاستيعاب كل ما يدركه من علم، ومعرفة، ولغة وفكر، وكان يستطيع في لحظة واحدة على اكتشاف عوالم جديدة، وآفاق، واسعة، وقد ساعده على ذلك ما ناله من الثقافة العصرية والدراسات الغربية، ما بين الهند وإنجلترا وألمانيا، وما توفّر له من تجارب وملاحظات، واستدراكات، وما أثر فيه من الأساتذة البارعين تأثيرا كبيرا إذ غرسوا فيه حب العلم، وروح الدين، وفلسفة

(١) أبو الحسن علي الحسيني الندوي،روائع إقبال،ص:٣-٤

التصوف حتى بات من أفذاذ الشرق الإسلامي في ثقافته الغربية، وأفكاره النامية، ومعانيه الناضجة، ونزعاته الدينية الخالدة[١].

وقد رزق إقبال نعمة الإيمان، ومحبة الدين، وصفاء الضمير والوجدان عن الوراثة، وتطورت معه هذه النعمة التي كانت مصدر قوته ومنبع حكمته، ورافقته طول حياته، وتفتحت معه في قريحته، وجادت وسالت معه في أغراضه وأفكاره، كما جرت في كيانه مجرى الدم، حيث بوأت له مكانة عظيمة في دنيا الفن والأدب وعالم الفلسفة والحكمة، وأغنته عن الملوك والسلاطين، وعن الأقيال والقياصر، ولم تفتر عنه ولم تغب حتى ينزلق مزلق الآخرين أمام المادة ومغرياتها، وتيار الحضارة الغربية الجارفة[٢].

وكان القرآن الكريم من أفضل وأقوى العوامل التي أثرت في تكوين شخصيته عقلاً ومعرفة، وكان هذا التأثير ليس تأثيرا عاديا يزول مع الوقت، وينتهي مع نهاية فترة القراءة[٣]،بل ظل معه إلى آخر حياته، وقد وظف روح القرآن وحكمه في نظمه وإنشاده، واستقى مادة شعره من مناهل القرآن ومنابعه، وقد عاتب المسلمين عتاباً شديداً لما أعرضوا عن هذا الكتاب وأهملوه إهمالا قد أدى إلى سقوطهم وتدهورهم في أبيات جميلة مما يدل على مدى شغفه بالدين وولوعه به[٤].

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر[٥]

نالوا العزة في زمانهم حين كانوا مسلمين وأنتم أصبحتم أذلاء بعد أن هجرتم القرآن[٦]

ومن المؤثرات القوية التي تستحق الذكر هي معرفة النفس والذات، والإمعان في أعماقها، والاعتزاز بقيمتها، والاحتفاظ بكرامتها، قد أسهمت إسهاماً كبيراً في بلورة شخصيته وبلوغها أوج الكمال، وهي في الحقيقة عبارة عن فلسفته العظيمة التي قام عليها شعره، وبلغ بها ذروة مجده، وكانت دواوينه الفارسية والأردية خير مثل لهذه النظرية الذاتية[٧]،كما في الأبيات التالية:

---

(١) الدكتور رفيع الدين هاشمي وآخرون،مائة سنة لإقبال، والمقالة السابعة، لأبي الحسن الحسيني الندوي، العوامل التي كونت شخصية إقبال،إقبال إكيديمي،لاهور، باكستان،٢٠٠٧م،ص:٦٧

(٢) **ڈاکٹر اکبر حسین قریشی، مطالعہ تلمحیات واشارات اقبال، اقبال اکیڈمی، لاہور، پاکستان، ۲۰۰۴ء، ص:۵**

(٣) عبد الواحد،إقبال (فكره وفنه)، مترجم:نعيم الله ملك،أبو ذر ببليكيشن،لاهور،باكستان،ص:٣١

(٤) أبو الحسن علي الحسيني الندوي،روا ئع إقبال،ص:٤١

(٥) **علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال، نواب سنز پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۰ء، ص:۹۰**

(٦) علامة محمّد إقبال،الأعمال الكاملة،تقديم وتحقيق وترجمة:الدكتورحازم محفوظ،الآفاق العربية،القاهرة،مصر،الطعبة الأولى:٢٠٠٥م،ص:١٩٩

(٧) هاشمي،وسهيل عمروآخرون،مائة سنة لإقبال،العوامل التي كونت شخصية إقبال،ص:٦٧

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن[١]

فتش سر الحياة، بعد ما تغرق في مراقبة نفسك لو لم تكن قريبا مني،فلا بأس،ولكن كن قريبا من نفسك[٢]

وكان سحر الطبيعة الفاتنة والنفحات السحرية من أكبر وأعظم العوامل التي يرجع الفضل إليها في تكوين سيرته وشخصيته، وفي قوة شعره وتأثيره، وانسياب الأفكار وتدفق المعاني، حيث يتصل بالطبيعة من غير حجاب، ويتعرض للنفحات السحرية، فيناجي ربه في آخر الليل بنشاط روحي جديد، ومن ثم يأتي بأشعار إسلامية مفعمة بروح دينية، وكانت هذه الساعات السحرية التي تدفع به لإيقاظ الآمال الجديدة والآماني النائمة مثل طلوع الفجر، وبزوغ الشمس، وبواكير الصبح، وطلائع البكورة التي تبدد الظلام، وتبث الأمل والعمل معا[٣].كما في البيت التالي:

کس قدر تم پر گراں صبح کی بیداری ہے ہم سے کب پیار ہے؟ہاں نیند تمہیں پیاری ہے[٤]

الاستيقاظ في الصباح (الباكر) ما أثقله عليك أنت لا تحبنا، ولكن تحب النوم[٥]

وبدأ يوقظ الأمة الأسلامية وشبابها من هذه الغفلة الجاهلية، ومن السبات العميق الذي غلب عليهم أكثر من قرن، ويحمس الشباب الإسلامي بقصائد مفعمة بروح الجهاد، وهو أول من طالب بوطن مستقل للمسلمين كي يمارسوا فيه شعائر الحياة الإسلامية، ويحافظوا فيه على القيم الإسلامية، والتعاليم الدينية في هذه البقعة. وقد أفسد أمرها وطأة الاستعمار الإنجليزي الهمجي الذي تحالف مع الهنود ضد المسلمين ظلماً و اضطهاداً، وفيما يلى مطلع قصيدته، عنوانها "أنشودة المسلم".

کبھی اے نوجواں! مسلم تدبر کیا تو نے وہ کیا گردوں تھا جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا[٦]

أيها الشاب المسلم، هل تدبرت يوما كيف كانت تلك السماء، التي أنت نجمها المكسور[٧]

---

(١) علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال، ص:١٤٦

(٢) علامة مُحَمَّد إقبال،الأعمال الكاملة،ص:٢٩٤

(٣) هاشمي،وسهيل عمروآخرون،مائة سنة لإقبال،العوامل التي كونت شخصية إقبال، ص:٧٦

(٤) علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال، ص:٨٩

(٥) علامة مُحَمَّد إقبال،الأعمال الكاملة،ص:١٩٧

(٦) علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال، ص:٧٩

(٧) علامة مُحَمَّد إقبال،الأعمال الكاملة،ص:١٩٥

النزعة الروحانية في صوره الشعرية

لايبلغ الأدب مبلغ الروعة الخالدة، ولا يرتقي إلى منتهى التأثير الفني، وغاية التفاعل مع الشعور الداخلي والخواطر الجياشة؛ إلا إذا تحلّى بالعاطفة الصادقة، والخيال المبتكر الطريف ترفدهما الأفكار السامية والقيم الخالدة، وذلك لأن المضمون هو روح الشعر ومصدر الإعجاب به، وهي الحالة النفسية التي يعانى منها الشاعر، ونجوى الوجدان الذي يهزبه قلب كل إنسان في كل زمان ومكان.

وقد كان إقبال يمتاز بذكاء حاد ونادر، وكما أنه كان شاعرا فطرياً مطبوعا ينزع منزع المصور الحاذق البارع الذي اجتمعت له ملكة التمثيل وقوة البيان، وسلامة الذوق، ورهافة الحس، توفرت له أفانين التصوير والتلوين، فلم ينشد الشعر لإرضاء الخواطر أو تلبية للقريحة الفنية، ولا تكسبا للجاه والمال والشهرة، بل نصب نفسه واعظا حكيما، وأخذ على عاتقه إصلاح الأمة، وتربية المجتمع، فعمد إلى النصح والإرشاد في خيال رائع حصيف حيث نظم شعره بطابع فكري يغذيه العقل المتزن، والخيال الفسيح العالي، وساعدته في ذلك كله ثقافته الواسعة، وإطلاعه الكثير العميق، وخلفيته الدينية الراسخة، وملاحظاته الدقيقة، واستدراكاته القيمة، فخرج شعره حاملا القوة الإيمانية، والفلسفة الروحانية، حيث يعبر عن العاطفة المتدفقة التي يمثلها الخيال كصور طافية تحوم أمام عيوننا، وتدخل كوامن الشعور وخلجات النفس، فيبقي تأثيره حيا مع طوال العمر ويتجدد في كل مرة حين تقبل عليه النفس قراءة واستحضارا[١]. كما يتجلى ذلك المزيج الإيماني حين يشارك الشعب في أفراحه وأتراحه، ويتألم لألمه، ويتوجع لوجعه لاتصاله به، ويحس ويشعر بالآلام التي حلت به ونزلت فصار لسان حاله حيث يرافق بين التأثير المؤلم وبين اللذة الشعرية، ويراوح بين الإيمان واللذة الروحانية التي تتسلى بها النفوس، وبين المتعة الأدبية التي تجعلهم إلى عالم آخر، ويستشرفون من خلال ذلك مستقبلا منيرا كما نرى في هذا البيت:

اٹھ کے بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے مشرق ومغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے[٢]

انهض، فإن أسلوب محفل الدنيا (أسلوب) آخر وفي الشرق والغرب يكاد يبدأ دورك[٣]

ضمیر لالہ میں روشن چراغ آرزو کر دے چمن کے ذرے ذرے کو شہید جستجو کر دے[٤]

---

(١) أبو الحسن علي الحسيني الندوي،روا ئع إقبال،ص:٣٩-٤٠

(٢) علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال، ص:١١٧

(٣) علامة محمّد إقبال،الأعمال الكاملة،ص:٢٤٥

(٤) علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال، ص:١٢٠

أشعل مصباح الأمنيات في قلب الوردة الحمراء واجعل ذرات البستان ضحية البحث[١]

نشعر بأن العاطفة صادقة وخالصة يحرك بها الشاعر النفوس الإنسانية وهي تتطلع إلى الله سبحانه تعالى، وتعود إلى الإيمان والتوحيد، وتسترجع لهذه الأمة المجد والشرف، وكما يتوجه في عجز البيت إلى استكمال موقفه وإتمام هدفه الأساسي حيث يطلب بوصفه داعية إسلامياً كبيراً، ويريد من المؤمن أن يكون ذا جهد متواصل وكفاح مستمر، وأن يقبل على العلم والبحث والتحقيق كل الإقبال، وألا يتخلف عن ميدان العلم والدراسة والتحقيق ليسهم إسهامات علمية بارزة تجاه رقي هذه الأمة الإسلامية، ونهضتها، ورفعتها، وسموها.[٢]

ولو أمعنا في البيت السابق لوجدنا أنه لم يتعرض لهذه المعاني الكريمة والأفكار النبيلة مباشرة بالأسلوب الخطابي الصادع، بل قدمها في صورة جميلة خلقها من قوة خياله وتصويره الفني الرائع حيث رمز للمؤمن بالوردة الحمراء، واختار الحديقة للدنيا، وصور الإيمان بالمصباح الذي يخرج الإنسان من الظلمات إلى النور، ومن الضلال إلى الرشاد، ومن الجور إلى العدل، وهكذا كان ماهراً وحاذقاً في استخدام الأدوات الشعرية، والراوفد البلاغية حيث كان يجرى العاطفة والخيال يتوازان في إطار خدمة رسالته العظمى ويوظفهما فيما يريد.[٣]

وكان همّ الأمة الإسلامية الثقيل الكالح يضاجعه ويضايقه ولا سيما إذا آوى إلى سريره، وكان ينظر إلى أحوال المسلمين، ويتألم لألمهم، ويتوجع، ويحزن على هذه الأوضاع والظروف التعسة التي تمر بها الأمة الإسلامية بصفة عامة، ومسلمي شبه القارة بصفة خاصة، وكان يريد أن يوقظ الأمة الإسلامية ومسلمي شبه القارة من سباتهم العميق بشعره، ويريد أن يبعث فيهم روح الإيمان وحرارة الإسلام وجذوة الجهاد، فسمع أهل شبه القارة غناءه ونداءه، فأعجبوا به وأحبوه حباً جماً، وانتقل حب أهل شبه القارة إلى الشرق الأوسع، وإلى العالم كله بما يتضمن شعره من المعانى الأفقية والقيم الروحانية الخالدة في أخلية نادرةً وصور متبكرة كما نرى ذلك في هذه الأبيات :

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتیں ہیں زنجیریں[٤]

إن السيوف والتدابير لا تفيد في(حالة) العبودية وحينما تنشأ لذة اليقين (عندئذ) تنقطع السلاسل (بنفسها)[٥]

(١) علامة مُحَمَّد إقبال،الأعمال الكاملة،ص:٢٤٨

(٢) غلام صابر،إقبال شاعر فردا،ص:٢٠

(٣) المصدر السابق،ص:٢٠

(٤) علامہ محمد اقبال،کلیات اقبال،ص:۱۲۲

(٥) علامة مُحَمَّد إقبال،الأعمال الكاملة،ص:٢٥٠

كما نرى في هذا البيت أيضا :

نکل کے صحرا سے جس نے رومیوں کی سلطنت کو الٹ دیا تھا سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا[١]

وهي التي قلبت سلطنة روما بعد ما خرج من الصحراء سمعت من الملائكة أن هذا الأسد سيكون منتبها من جديد[٢]

لاشك في ذلك، فقد كان إقبال يحمل في نفسه روحا إسلامية خالصة، لا غموض فيها ولا عسر ولا التواء، وهذه الروح الإسلامية تحببه إلينا، وهي التي تجعله يتحكم في القلوب، ويستولي على العقول، ويستأثر بالمشاعر والأحاسيس، وكان يدعو إلى اليقظة الإسلامية، وإلى الصحوة الدينية، ويقود الأمة إلى الإسلام واسترجاع المجد، وإعادة ذلك الشرف والمنزلة، ويحثهم على الجهاد، وطلب الحق، وسيادة الإسلام، وقيادة المسلمين كما يقول أبو الحسن على الحسني الندوى: "ولكن مُحَمَّد إقبال يعتقد أن الصدمات السياسية التي أصيب بها العالم الإسلامي أقضت مضجع المسلمين، وأيقظتهم، ودبّ فيهم دبيب الحياة، يقول في قصيدته البليغة "طلوع الإسلام" إذا رأيت النجوم شاحبة منكدرة تخفق، فاعلم أن الفجر قريب، ها هي الشمس قد ذر قرنها من الأفق، وولى الليل على أدباره، إن عاصفة الغرب قد أعادت المسلم إلى الإسلام، فإنما تتكون اللآلىء في البحر المتلاطم الهائج، لقد دبّ دبيب الحياة في الشرق، وجرى الدم الفائر في عروقه الميتة، وذلك سرّ لا يفهمه ابن سينا والفارابي، إن المسلم سيمنح من الله الأبهة التركية، والذكاء الهندى، والنطق العربى، ويقول في بيت: "إن إقبال ليس يائسا من تربته الحقيرة، فإنها إذا سيقت، أتت بحاصل كبير"[٣].

وقد صور لنا فلسفة الحياة الفانية لكل إنسان في كل زمان ومكان في هذه الصورة التي قد استمد مادتها أيضا من الطبيعة الساحرة المبتهجة، وكانت هذه الصورة تحكى لنا رؤية كاملة لموقفه.

زندگی انسان کی ہے مانند مرغ خوش نوا شاخ پر بیٹھا کوئی دم چہچہایا, اڑ گیا[٤]

إن حياة الإنسان مثل الطائر جميل الصوت(المغرد) (الذي) جلس لحظة على الغصن ، غرد ثم طار[٥]

---

(١) علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال، ص:٦٢

(٢) علامة مُحَمَّد إقبال،الأعمال الكاملة،ص:١٤٧

(٣) أبو الحسن علي الحسيني الندوي،روا ئع إقبال،ص:١١١

(٤) علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال، ص:٦٦

(٥) علامة مُحَمَّد إقبال،الأعمال الكاملة،ص:١٥٥

وقد تناول فلسفة الحياة في صورة حسية بصرية تعطى ألطف الإحساس، وأعظم الإدراك لعدم ثبات هذه الدنيا وفنائها، وإنها لا تستقيم لأحد ولا تتماشى مع أحد، وإنها مثل هذا الطير المغنى الجميل الذي يجلس على غصن من غصون الشجرة، ويغرد لبرهة من الزمن، ثم يطير، وهكذا فإن الإنسان يأتي إلى هذه الدنيا ليتنفس لمدة قصيرة، ثم يتوقف نشاطه بانتهاء أجله.(١)

ومما يلاحظ في شعر إقبال إعجابه بالوردة الحمراء وشيوعها في شعره حيث أنها كانت تحتل مكانة عالية، ومنزلة سامية في شعره، وكانت بالجملة أكثر تشبيهاته تدور حول هذه الوردة الحمراء، وصارت رمزا من رموز شعره، وعلامة من علاماته المشهورة، كما نراها في الصورة التالية أيضا:

خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے قبا چاہیے اس کو خون عرب سے (٢)

الوردة الحمراء، منذ متى تنتظر في البستان؟ وإنها تريد الدماء، من قباء العرب(٣)

لقد أخذ هذا البيت من قصيدة إقبال المشهورة التي تعرض فيها لدعاء طارق بن زياد، وكان قد عبر البحر، ووصل إلى أسبانيا، فلما وصل إليها أحرق الفلك والمراكب وراءه، وعزم عزماً شديداً على فتح الأندلس، وقد صور طارق الأندلس في هذا الدعاء حديقة يانعة، وجنة خضراء ممتلئة بالزهور والورود، وكانت الوردة الحمراء التي تعتبر مبلغ جمال هذه الحديقة، ومنتهى حسن الربيع فيها تنتظر المسلمين العرب ليراقبوا ويشرفوا على هذا البستان الأخضر، وكانت هذه الوردة الحمراء تريد أن تلبس رداءً أحمر لتكون أكثر لمعانا وأزهى جمالاً وأعظم حسناً، ونرى أنه يشبه دماء العرب بالرداء الأحمر، وهذا الرداء ينزل على هذه الوردة الحمراء الذي يحافظ عليها من القطف والخطف، ومن الذبول واليبس.(٤)

وقد دعا إقبال في هذه الصورة دعوة الجهاد بطريقة مبتكرة، وصورة أخاذه حيث رغّب المسلمين على ذلك وشجعهم على الشهادة والاستماتة في سبيل الله لأجل إعلاء كلمته الخالدة، ونشر دعوته الصالحة، ولكنه تصدى لهذه المعاني السامية والدعوة العظيمة في خيال قد استمد عناصره من الطبيعة، وتناول الوردة الحمراء في صورة جديدة تريد أن تحفظ نفسها، وتصون كرامتها برداء المسلمين الذي قد نسج من دمائهم.

---

(١) ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، تفہیم بال جبریل، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ٢٠٠٦ء، ص:٢٥٩

(٢) علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال، ص:١٧٠

(٣) علامة محمّد إقبال، الأعمال الكاملة، ص:٣٤٦

(٤) ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، تفہیم بال جبریل، ص:٢٨١

نقد الحضارة الغربية في صوره الشعرية

كان رحمه الله يقصد الأذهان بالتأثير العاطفي والجمال الفنى المحكم، ويوجّه العقل الإنساني، حيث يملى عليه التوجيهات الإسلامية، ويذكّي في نفوس الناس عاطفة الإيمان، وجذوة الإسلام وقنديل الحضارة الإسلامية الخالدة حيث تتجلّى فيها قدرته على المزج بين الوظيفة التي يرغّب فيها للتصوير الفني الأدبي، وبين الغايات الإسلامية والمفاهيم الإيمانية التي حقّق فيها جدارته ومهارته على تغطية كلا الجانبين معاً، وهما المتعة العقلية، واللذة الذهنية، والإيحاءات الإيمانية، والخواطر الإسلامية التي تحرّك مشاعر الإنسان وانفعالاته تجاه المسؤولية العظمى التي خلق الله سبحانه وتعالى الإنسان لأجلها، وها هو يوضّح للمسلمين ضلالة الحضارة الغربية، وفداحتها، ووخامتها في هذه الصورة التي تترك في النفس أبلغ التأثير.

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا[١]

ثقافتك تنتحر بخنجرك والعش الذي سيبنى على غصن ضعيف، لا يدوام[٢]

لقد خلق لنا الشاعر هذه الصورة لتدل على دناءة هذه الحضارة، وقد حدّد لها منزلتها حيث اخترع لنا بقوة خياله في صورة الجاني الذى يمسك في يده خنجراً حاداً، على سبيل الاستعارة المكنية، ويريد أن ينتحر بهذا الخنجر عند ما انكشف أمره على الناس، وظهرت حقيقته، ورأى عاقبته الوخيمة، ومستقبله في السجن والقيد حيث لا مفر له ولا انفلات منه على كل حال.

وقد صوّر حالة هذا المجرم الجاني بحالة هذا العش الذي بنى على قضيب ضعيف، ويرى هذا القضيب من بعد كأنه بنيان ثابت أو صرح عظيم، ولكنه يسقط بنفسه وينهدم داخليا لأساسه لم يقو وبنيانه لم يستقر.

ولقد أثر الشاعر في النفوس والأفئدة بضرب هذين المثلين، وصوّر لنا فيها أزهي منظرا لضلالة الحضارة الغربية، وثقافتها الفاسدة من داخلها، وكان إقبال من كبار نقاد الحضارة الغربية، وقد ألم بها وعايشها عن كثب، وتعمق في ثناياها وسبر أغوراها حتى غاص على استجلاء جميع وجوه الاستكراه، ومواطن الضعف ومواقع الانحطاط. وعمد في ضوء ذلك هداية المسلمين والأمة الإسلامية، ثم حاول تقريب الحقائق الأصلية والتجارب الصادقة لهم بضرب هذه الصورة المخفية.[٣]

وقد خلقت فينا هذه الصورة أثرا عميقا، لا يزول مع الوقت، بل يتجدد لكل من يريد القراءة زيادة المعرفة، كما يؤكد هذا المعنى في صورة أخرى أكثر دلالة، وأعظم وقعاً في النفوس، وأقرب إحساساً إلى تدهور هذه الحضارة وضعفها.

---

(١) علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال، ص:٦٣

(٢) علامة محمّد إقبال، الأعمال الكاملة، ص:١٤٧

(٣) مولانا غلام رسول مہر، مطالب کلام اقبال اردو، مترجم: شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیوٹ لیمٹیڈ)، لاہور، طبع اول، ص:٢٢٩

دبا رکھا ہے اس کو زخمہ ور کی تیز دستی نے بہت نیچے سروں میں ہے ابھی یورپ کا واویلا [(١)]

إن يد الموسيقي السريعة تضغط إن ضوضاء أوربا غامضة[(٢)]

يكشف لنا الشاعر في هذه الصورة الفنية حقيقة الحضارة الغربية التي تقوم على النظريات الفاسدة والأفكار الملحدة، وإنها تخلو من الروح الدينية، والقيم الأخلاقية الإنسانية الخالدة،فيصورها بذلك المغنى الحاذق الذي يضرب على القيثارة الموسيقية بكل نشاط، وحماس، ويخرج الألحان الصارخة، والنبرات المرتفعة، والذبذبات اللاواعية، وكان يريد بذلك كله أن يغطي ويخفي وراء هذه الصرخات، والطلقات الطموح الديني، والنزعة الأخلاقية، والعكوف على الدين.

بيد أننا نرى أن هذا المعنى يحمل إليهم في ثناياه هذه الألحان والأغاني، والعواطف الفاسدة، والخواطر الماجنة حيث لا قيمة لشعرهم، ولا حلاوة لنظمهم، ولا إيقاع لنبرهم، ولا معنى لذبذباتهم،فلا فائدة لهم في هذا الغناء،بل إنه كان خاليا من الأمن، والخلق الطيب، والراحة المعنوية، إنما يزيد في التوتر، والتوعر، والثقل.[(٣)]

وقد لا حظنا في هذه الصورة الرمزية التي تحقّق من خلالها تقريب الحقائق إلى النفوس، واستبيان أقصى معاني هذه الحضارة، والتضلع فيها لاكتشاف رواسبها ومساوئها، فإنها بدأت تنادى بالحرية، وترفض المذهب والدين، وتنكر القيم الأخلاقية والمثل العليا، فصارت مثل هذه الألحان اللامعقولة، والأغاني اللاواعية، وأقبلت على المادة كل الإقبال، وارتاحت إلى الانتهازية كل ارتياح، فاستسلمت للمادة، وخضعت للنفس، وركنت إلى اللذة المؤقتة والتمتع القليل، ولها هيكل عظيم في ظاهرها، وباطنها فساد وخراب، وصرح عظيم لا أساس له، وكينونة ضخمة في إطارها، ومنخرطة في داخلها، مثل هذا الغناء الظاهرى لا شيء فيه غير هذه الصرخات والضوضاء والشنشنة كما نرى في البيت التالي كذلك.

گرچہ ہے دلکشا بہت حسن فرنگ کی بہار طائرک بلند بال! دانہ ودام سے گزر[(٤)]

مع أن ربيع الفرنجة جذاب وجميل إنها الطائر،طويل الريش،امض من (قيد) الحبكة والشبكة[(٥)]

ويرسّم لنا الشاعر صورة أخاذة في صورة "التشبيه الضمنى" حيث يشبه الحضارة الغربية في بهجتها، ومسراتها، وترفها الهائل، ونعيمها الطائل بالشبكة التي نصبت وأقيمت لتصطاد بالمرصاد كل طائر طويل

---

(١) علامہ محمد اقبال،کلیات اقبال،ص:۱۴۴

(٢) علامة محمّد إقبال،الأعمال الكاملة،ص:٢٨٨

(٣) ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، تفہیم بال جبریل،ص:۶۲

(٤) علامہ محمد اقبال،کلیات اقبال،ص:۱۴۶

(٥) علامة محمّد إقبال،الأعمال الكاملة،ص:٢٩٣

الريش، عظيم الهدف، على المنزل، وكان من الطير ما لا ينظر إلى العاقبة، وينسى الهدف الأسمى، ويقبل على الحبوب دون الإحساس بهذه الشركة، ويسقط على هذه النعمة والمتاع القليل، وعدم معرفة العواقب والمصير، وإنما يخدع نفسه حتى يلقى بها إلى التهلكة.

ومما يحمد لإقبال في هذا الصدد، إنه لا يقصد المعاني العادية المتمثلة في هذا التشبيه العادي، وذلك لأن تشبيه الشركة للصياد بالحبوب تشبيه متناول، إذ لا يوجد فيه ابتكار لا كليا ولا جزئيا، ولكننا نرى من خلال هذا التشبيه الرؤية البعيدة التي قد قصد إليها، والخيال البديع الذي أراد أن يحيط به هداية، ووقاية لنا من سوء هذه الحضارة الضالة، حيث وضع لنا هذا الإحساس العميق، والخاطر القوي على لوحة فنية سهلة الإدراك، عميقة الفكر، بعيدة المدى والشأو، وهو لأن هذه الحضارة الغربية الضالة إن كانت تدعو إلى المسرات، واللذات، والترف، والبذخ، وهي تقود الإنسان من الداخل إلى الهلاك والدمار لكونها خالية من التربية الأخلاقية، والقيم الروحانية العظيمة، والكرامة الإنسانية، ومن ثم تفقد في كيانها لمتبعيها الراحة القلبية، والإطمئنان الداخلي، والهدوء المريح، فلجأ إلى هذه الصورة التشبهية إلى تحقيق وتقريب هذه الحقيقة الثابتة إلى أعماق قلوبنا مشاعرنا.

العاطفة الصادقة لديه

كانت العاطفة إحدى الأدوات الشعرية التي يريد بها إقبال أن يقرب الحقائق إلى الأفهام والعقول، وإلى الإدرك والشعور، بصياغة جميلة، وأسلوب فنى متقن، فيغوص وراء المعاني العميقة والأفكار الدقيقة بفضل ثقافته الواسعة، واطلاعه الكثير، ويحسن استخلاص النتائج المثمرة من المقدمات بطرق علمية.

فيتحلى شعره بالعاطفة الإنسانية الخالدة التي تتمثل في الطموح، والحب، والإيمان، وسمو النفس، وبعد النظر، وعميق التجربة، والحرص على سيادة الإسلام، لأنه يصدر عن نفس وراءها قلب صادق، وينساق عن عقل وراءه نور وإيمان، ويندفع عن فلسفة وراءها روح إسلامية، فبثّ هذه المشاعر الروحانية، والعواطف الخالصة في شعره محافظا على الروعة الفنية، والجودة الشعرية، والقوة البيانية حيث لم يدع للعقل مجالا يطغى على فن الشعر فيضعف مستواه، وتذهب روعته، كما لم تضلله الأخيلة البعيدة عن مدار الإدراك والشعور، وعن تأملات الفطرة وملاحظاته، فيصير الشعر عاجزا عن تحقيق المتعة الفنية، وأداء الوظيفة الأساسية، والرسالة الخالدة، والهدف الأسمى، فيذكر لنا في هذه الأبيات صفات الأتراك الحسنة،من حيث تمسكهم بالدين الإسلامي الذي اعتصموا به اعتصاما قويا كالعروة الوثقى، وكانوا خير القائمين عليه، وأنجزوا إنجازات باهرة وأحرزوا قصب السبق في جميع الميادين وكافة الحقول، ولم يكونوا متزودين بتلك الأسلحة، والأدوات الحربية المستحدثة التي تسلح بها اليونانيون والرومان الذين زحفوا عليهم كالنسور، لكنهم أخفقوا في هذه الحرب، وفشلت جهودهم، وغرقت سفنهم التي كانت

تسير في ظلمات البحر وتقعراته، بينما نجحت تلك الوجوه التي كانت نواصيها متلطخة بالتراب والطين من كثرة السجود لخالقهم ومالكهم وبارئهم، ولم يقاتلوا ولم يجاهدوا إلا لأجل إعلاء كلمته الخالدة، ونشر دعوته السماوية الربانية،[١] وتلك هي العواطف النبيلة المحترمة النقية التي يبثها هذا الشاعر – الداعي الكبير– في النفوس والقلوب حيث لا ينضب معينها ولا يخبو أوارها، وأخذ يشحذ مشاعرنا ويشجع هممنا على أن نجدد تلك الإنجازات الباهرة والمآثر الخالدة، وأن نسترجع ذلك الشرف المفقود والمجد الغابر،وأن نستعيد للأمة ذلك التشخص الكامل، والهوية المستقلة، وأن نرد إلى هذه الأمة تلك السيادة والرئاسة التي كنا نحظي بهما، ونعتز بهما في العالم الإنساني اعتزازا وافتخارا، وكم كانت هذه السيادة والقيادة متميزة في المعمورة لما فيها من عدل، وإنصاف، ومساواة، وأخوة، واحترام للإنسانية، وكرامة للحضارة الإنسانية العظمي.[٢]

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال وپر نکلے — ستارے شام کے خون شفق میں ڈوب کر نکلے
ہوئے مدفون دریا زیر دریا تیرنے والے — طمانچے موج کے کھاتے تھے، جو بن کے گہر نکلے
غبار رہگذر ہیں، کیمیا پر ناز تھا جن کو — جبین خاک پر رکھتے تھے جو، اکسیر گہر نکلے[٣]

رحل الذين وثبوا كالعقاب، بلاجناح ولاريش، — وطلعت النجوم بعد أن غرقت في دماء الشفق
السباح صار مدفوناً (غارقاً) تحت النهر — وهو الذي كان يصطدم بالأمواج، ويصبح لؤلؤا
(الفلاسفه) الذين كانت تفتخر بهم الكيمياء، — والذين كانوا يصنعون جبينهم على الأرض،
صاروا غبار الطريق — أصبحوا يجدون الإكسير[٤]

وكان إقبال يعد أكبر شاعر فلسفي وروحاني، تهيأله مالم يتهيأ لغيره من سلامة الفطرة، وعذوبة المعاني، وحرارة الروح الإيمانية، وطلاقة البديهة، وسعة الثقافة، فأجاد التعبير عن خلجات النفس، وخواطر الشعور، فأصبح شعره–من ثم– يصلح لكل زمان ومكان، ولكل عصر ومصر، وذلك أنه في شعره داعية إلى قول أجمع، وبيان أوسع، وبرهان أنصع في أسلوب أجذب للقلب، وأخلب للب، وأصغى للأسماع، وأدنى إلى الاقناع، وكان يستمد مادته من الذكر الحكيم، كأنه تنزيل من التنزيل، أو قبس من نور الذكر الحكيم كما نرى في هذه الأبيات إذ صوّر لنا منظراً جميلاً ورؤية حسية ما كان عليه الناس في العصر الجاهلي قبل بعثة الرسول ﷺ.

---

(١) ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی، شرح بانگ درا (لغت اور تشریح)، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، طبع اول، ٢٠٠٦ء، ص:٤٥٠

(٢) غلام صابر،إقبال شاعر فردا،ص:٢٩

(٣) علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال، ص:١٢٢

(٤) علامة محمّد إقبال،الأعمال الكاملة،ص:٢٥٢

ہم سے پہلے تھا عجب ترے جہاں کا منظر کہیں مسجود تھے پتھر، کہیں معبود شجر[١]

كان منظر العالم قبلنا عجيبا كانت الأحجار يسجد لها في مكان، وكانت الأشجار تعبد في مكان آخر[٢]

وهكذا خلق لنا صورة ينتقل منها بالعاطفة إلى الروح، ورسم لنا لوحة فنية تشرق ألفاظه البسيطة السهلة كالمصابيح، حيث يعطي كل مصباح منظراً جذاباً، وصورة أخاذة، كما نرى في هذا البيتتمكنه من إعطاء صورة للمساواة، والتفاضل، والتفاوت بين الناس بالعدل والإنصاف إذ لا فرق بين حاكم، ومحكوم وبين ملك، ورعية وبين غني، وفقير، في الصلاة في صف يستوى فيه الأغنياء والفقراء، والملوك والعامة، والحكام والمحكومين في كلمات بسيطة تخلق لنا رؤية حسية، وتوحى بمنظر أكثر جذبا، وأقدر إدراكا.[٣]

آگیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز قبلہ رو ہو کے زمین بوس ہوئی قوم حجاز
اک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود ایاز نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ صاحب ومحتاج وغنی ایک ہوئے تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے [٤]

لوحل وقت الصلاة في وقت الحرب فشعب الحجاز توجه إلى القبلة وسجد
لقد قام محمود الغزنوي وأياز في صف واحد (في الصلاة) ولم يكن هناك فرق بين الولي والعبد (الحاكم والمحكوم)

إن العبد، والسيد، والفقير، والغني صاروا وحدة حينما وصلوا إلى حضرتكم صاروا متساوين[٥]

كما أنه غذى شعره بالعاطفة الصادقة التي تتمثل في الخيال النادر الرائع الذي يضبط الشعور ويسيطر على المخيلة، فيردها إلى حدود الجمال الفني المحكم، وإطار الجودة، وحيز الصور الناطقة الموحية حيث لا قيمة للعاطفة بدون خيال، ولا يرتاح هذا الخيال إلا إلى هذه العاطفة الإنسانية الخالدة المتمثلة في الصور، ويتجلّى هذا المزيج المتآزر في شعره، وفي رسالته أعظم مما تجلى في شعر معاصريه، وهذه هي أهم العناصر والعوامل التي تجعل شعره حيا في القلوب، باقيا فيها، مسايرا لكل عصر ومصر، وذلك لأنه يحمل

(١) علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال، ص:٣٧
(٢) علامة مُحَمَّد إقبال،الأعمال الكاملة،ص:١٦٨
(٣) مولانا غلام رسول مہر، مطالب کلام اقبال اردو، مترجم، ص:٢٧٧
(٤) علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال، ص:٢٧
(٥) علامة مُحَمَّد إقبال،الأعمال الكاملة،ص:١٧٠

رسالة إلهية، وفكراً سليماً، وروحا دينية، في صور فنية موحيه يأسر بها النفوس، ويملك بها الألباب، وكما كان يتغلل منها إلى أعماق القلوب وأدق المشاعر في هذا البيت:

میری مشاطگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی (١)

إن حسن المعنى، ليس في حاجة إلى زخرفتي لأن الفطرة تحيط بالحناء بنفسها(٢)

كان إقبال يدعى في هذه الصورة بأن شعره لا يحتاج إلى زخرفة، ولا يفتقر إلى تزين داخلي وخارجي، وذلك لأنه يحمل في طياته موضوعات قيمة ذات توجيهات دينية، وقيم خالدة، وطقوس إسلامية حيث لا حاجة لاستخدام الكلمات المصطنعة، ولا التراكيب المكلفة، ولا الأوزان الثقيلة كما نرى في حالة الوردة الحمراء التي تنشأ في الأرض محمرة منفتحة من فطرتها الطبيعة، وجبلتها الخليقة التي خلقها الله بها، وهكذا أنها لا تحتاج إلى الحناء ولا تزين ولاتبتل.

ومما لا شك فيه أن شعر إقبال يحمل هداية وإرشادا للناس، ويعتبر أفضل تعبير عن القيم الإسلامية وعبارة عن روح الدين، وهداية لمن يريد التقوى والفوز، وقد صوّر لنا الشاعر هذا المعنى في صورة توحي إيحاءً جميلا، وتفيد رؤية أجمل وأحسن، كما نرى ذلك على سبيل المثال في تشبيهه حيث شبّه شعره بالشعلة المشتعلة ولهيبها بالنواح، وهي توقد وتضاء كالقنديل، ولا تقدر ولا تعرف قيمتها إلا في الليل المظلم الحالك، وتزاد أهيمة هذا القنديل لتلك القافلة التي قد أضلت الطريق وأخطأته في هذه الليلة المظلمة، وهذه القافلة تريد أن تلحق بالهدف والغاية المنشودة، فشعرى هذا يعمل عمل القنديل، ويبدد الظلمات الداجية، ويكشف لها الطريق السالك في هذا الظلام العميق.(٣)

اندھیری شب ہے، جدا اپنے قافلے سے ہے تو ترے لیے ہے مرا شعلہ نوا قندیل(٤)

إن الليل مظلم، وأنت مفارق قافلتك فنواح شعلتي، لك كالقنديل(٥)

فرسم لنا إقبال هذه الصورة الرائعة التي يحاول أن يرشد من خلالها الأمة الإسلامية تجاه الخير والحق حيث صوّر لنا هذه الدنيا كالليلة الحالكة قد سادها الظلام، وعمها الدجى، وكان المسلمون قد أضلوا الطريق المستقيم بها، وأخطأوا، وكانوا يتيهون تيها لا مخرج له، ويحومون حوما بدون دليل ومخرج في الصحراء المقفرة.

---

(١) علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال، ص:١٤١

(٢) علامة مُحَمَّد إقبال،الأعمال الكاملة،ص:٢٨٢

(٣) ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، تفہیم بال جبریل، ص:١٧٣

(٤) علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال، ص:١٥٧

(٥) علامة مُحَمَّد إقبال،الأعمال الكاملة،ص:٣١٦

وفي هذه الحالة القاسية يظهر شعره كالقنديل الذي يبدد الظلمات، ويمهد لهم الطريق السالك لكي يصلوا إلى غايتهم آمنين هادئين، ويتكرر هذا الفكر في بيت آخر في صورة أخرى.

صفت برق چمکتا ہے مرا فکر بلند کہ بھٹکتے نہ پھریں ظلمت شب میں راہی[١]

إن فكرى السامع يلمع، مثل البرق كي لا يضل المسافر الطريق في ظلمة الليل [٢]

وهنا رأينا أنه يشبه شعره مرة أخرى بالبرق الذي يلمع في الليل المظلم، وكأن المسافر الذي قد ضل الطريق، وزاغ عن الغاية يسترشد به في هذا الليل، وكان يضرب لنا هذه الصورة لتحمل إلينا هذه الأفكار الفلسفية، ويرى ظلام الدنيا كأنه هذه النظريات الفاسدة، والأفكار الضالة، وكان الناس قد تورطوا فيها، وزاغوا عن الهدف الأسمى، وكادت هذه النظريات تغلب العالم كله، وتغطيه بجميع جوانبه، فإذا شعره يظهر كالبرق وينير الطريق لمن يتوخى الهداية،ويتحرى الرشاد، ويضئ السبيل لمن يرجو الوصول إلى الغاية، والبلوغ إلى الحق المنشود[٣].

وقد ظهر لنا خلال هذه الصور الرائعة أن الشاعر سخّر قريحته لتوظيف التوجيهات الإسلامية، وإيغال النظريات الفلسفية التي تترجم عن الحضارة العربية الإسلامية الخالصة، فرسم لنا أعظم هذه المشاعر الدينية والعواطف الإسلامية التي يريد من خلالها هداية الأمة، وإرشادها، وتوجيهها نحو الخير والفلاح كما اتضحت لنا في هذه الصور المطروحة.

خاتمة البحث وأهم النتائج

تناولت في مستهل هذا البحث مفهوم الصورة الفنية، ومكانتها، وماهيتها، ووظيفتها الأساسية في النص الشعري، والحكم على أصالة التجربة لدى الشاعر، وقدرته على تشكيلها تشكيلا يحقق المتعة واللذة لدى المتلقى، ثم تتبعت حياته الفنية والأدبية مراعياً العناصر والعوامل التي اجتعمت وتآزرت في إبراز شخصيتيه الفذة، وحاولت الوقوف على الأبيات الشعرية التي تحمل صورا فنية رائعة تدعو فيها إلى الصحوة الإسلاميةن والنزعات الروحانية والعواطف الإيمانية بمهارته الفنية البارعة، وثقافته الواسعة، واستدركاته الدقيقة، وملاحظاته العميقة.

---

(١) علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال، ص:١٦١

(٢) علامة محمّد إقبال،الأعمال الكاملة،ص:٣٢٤

(٣) ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، تفہیم بال جبریل، ص:٢٠٤

استجليت القيم الجمالية والسمات الفنية التي يتميز بها، والتي امتد أثرها في الأغراض الشعرية المختلفة ولا سيما في نقد الحضارة الغربية، وإصلاح الأمة، وتربيتها، وبيان فلسفته، واتضح أثرها جلياً في الصور الفنية الرائعة.

وفي نهاية المطاف سجلت أهم النتائج التي توصلت إليها خلال كتابة هذا البحث، وصنفت قائمة المصادر والمراجع حسب الترتيب الأبجدي مع ذكر فهارس الموضوعات ليتنى للقارىء الاطلاع على أهم موضوعات البحث بكل يسرٍ وسهولةٍ.

- الصور الفنية مصطلح حديث في فن الشعر العربي، ولا شك أنها وسيلة حتمية لإدراك نوع متميز من الحقائق التي تعجز اللغة العادية عن توصيلها للمتلقى، وبالتالي هي الوسيلة الفعالة التي تكسب الشعر جمالاً وقدرةً على النفاذ إلى النفوس لتقبل النص الشعري وتتفاعل معه.
- الصورة الفنية تعتبر المعيار الأساسي في الحكم على أصالة التجربة لدى الشاعر، وقدرته على تشكيل تجربته الشعرية في نسق يحقق المتعة واللذة للمتلقي.
- يعد الشاعر العلامة مُحَمَّد إقبال من أعظم الشعراء الإسلاميين الذين أثروا في المتلقي عبر أسلوبه الشعري الجديد النابع من فكره، وخياله التصويرى البديع المستمد من منهل القرآن ومعينه، وعاش جاهدا لإيقاظ الأمة، وإرشادها بأشعاره التي عملت على حثّ، وتشجيع، واسترجاع المجد، واستعادة الشرف الإسلامي القديم، فضلا عن نشاطه الإبداعي والفني إحياء، وإضافةً، وزيادةً على ما فعله الشعراء السابقون.

يتميز رحمه الله تعال في وصف الطبيعة حيث يربط من خلالها عظمة الله سبحانه وتعالى وقدرته بفلسفته وتصوفه، فيسلم خياله إلى فطرته وجبلته الإسلامية ليخلق مناخاً إسلامياً، وبيئة روحانيةً إلى درجة أنه اخترع كلمات ورموز إسلامية مثل العقاب الذي شبه المؤمن به، والحديقة للدنيا والبلبل ويقصد به نفسه، وغير ذلك.

❁ ❁ ❁

ظاهرة الجرح على الواقدي عند المستشرقين (دراسة تحليلية)

The Phenomenone of Orientilist's Creticism on Al-Waqidī (An Anylitical Study)

د. عبد الصمد شيخ*

ABSTRACT

Muhammad bin Umar Al-Waqidi is known to be a prolific historian. His book on the maghazi of rasool Allah is very famous. His work is of great importance especially in context of chronological order and Prophet's different campaigns/expeditions. He is considered to be the converging point between the Madīnaḥ and 'Iraqī school of history. That is why he has been massively quoted and cited by Muslim as well as oriental historians.

Despite of all these, Al-Waqidī has been criticized by both Muhaddithīn and Orientalists. In fact, Muhaddithīn's criticism bases on some solid and valid grounds, but Orientalists's criticism posses no sound evidence. Mainly Al-Waqidī has been accused of Tashayyu', plagiarism and influence of Abbasid caliphs on his historic narratives by western critics.

In this article, I will try to impartially discuss these three critiques on Al-Waqidī.

Key Words: *Al-Waqidī, Plagiarism, Orientalist, Abbasid, Tashayyu'*

* أستاذ مساعد،قسم الحديث وعلومه،الجامعة الإسلامية العالمية،إسلام آباد

إن للواقدي رحمه الله مكانة متميزة في مجال علم التاريخ بالعموم وفي مجال السيرة النبوية بالخصوص. وله دور مهم في رواية أحداث السيرة ووقائع المغازي. ولا شك أن تصوير السيرة بكامله لا يمكن عرضه بدون الإستفادة من مروياته، لأنه من أوائل من دوّن في هذا المجال. وكان متنوع الثقافة والأخذ من مشائخه، ولذا كثروا مع تنوعهم في مجالات العلم المختلفة، وهذا ما يميّز الواقدي عن أقرانه.

مع كل فضله وجلالته في هذا المجال، أنه لم يسلم من الطعون والإتهامات التي وجهت إليه. فالطعون التي وُجّهت من قبل المحدثين لاشك أنها كانت علمية ومبنية على أساس، لكن الإتهامات التي تعرض لها الواقدي من قبل المستشرقين فهي لم تبن على أساس علمي، بل على مجرد الإفتراض والتخمين. وفي الحقيقة أن المستشرقين انقسموا في شأن الواقدي بين غايتين: فالغاية الأولى هي الإعتناء والإعتبار به كمؤرخ الإسلام الأوّل وترجيحه على كل واحد من المؤرخين الأُوَل دون مراعاة القرائن والظروف التي تحف بالخبر وترجح كونه صحيحا أو ضعيفا، ولا شك أنها ليست قرينة الإنصاف. والغاية الثانية هي تضعيفه بتهم شنيعة التي لم تثبت عنه، ولم يقل بها أحد من معاصريه. فالحقيقة أن أمر الواقدي عندهم بين هاتين الغايتين.

وفي هذا البحث أتعرض لمناقشة ظاهرة الجرح على الواقدي عند المستشرقين. والكلام فيه يدور على ثلاثة محاور رئيسية.

المحور الأول:الواقدي[1] رحمه الله كان متشيعا

إن من الطعون التي وجّهت من قبل المستشرقين إلى الواقدي رحمه الله هو كونه متشيعا. ولايشك أحد في أن هذا النقد قد وجّه إليه دون دليل، ولكن على أوهام ومفترضات فقط. ومن اللطافة أن هذا الاتهام لم يقل به أحد من علماء المسلمين إلا ابن النديم الذي كان من مواليد القرن الرابع الهجري مؤلف الكتاب "الفهرسة".[2]

(١) هو مُحَمَّد بن عمر بن واقد أبو عبد الله الأسلمي الواقدي، ونسبة الأسلمي للواقدي هي نسبة الولاء له حيث أن جده واقدا كان مولى لعبد الله بن بريدة الأسلمي. ولد بالمدينة في آخر خلافة مروان بن مُحَمَّد في بداية سنة ثلاثين ومائة كما قال كاتبه ابن سعد. وقد سافر إلى بلدان مختلفة وتتلمذ على أيادي من العلماء البارزين في عصره، ثم انتقل إلى بغداد حيث قويت هنا علاقته بأمراء بني العباس، وبقي في بغداد إلى أن نالته المنية بسنة سبع ومائتين، وكان عمره آنذاك ثمان وسبعون سنة. وقد عُرف بأعماله القيمة في السيرة النبوية وتاريخ المسلمين. من أشهرها كتاب المغازي وفتوح الشام. (البصري،مُحَمَّد بن سعد بن منيع،الطبقات الكبرى،تحقيق:إحسان عباس،دار صادر،بيروت،الطبعة الأولى:١٩٦٨،٥/ ٤٣٣،السمعاني)

(٢) ابن النديم،مُحَمَّد بن إسحاق،الفهرست،تحقيق:إبراهيم رمضان،دار المعرفة،بيروت،الطبعة الثانية:١٩٩٧،ص:١٢٧؛ وتبعه على ذلك إحسان إلهي ظهير. (ظهير،إحسان إلهي،الشيعة والتشيع،إدارة ترجمان السنة،لاهور،الطبعة العاشرة:١٩٩٥،ص:٨٥-٨٨)

وقد اتهم ابن النديم الواقديَ بالتشيع دون تقديم دليل على موقفه. ولهذا لم يتبعه أحد من المحدثين. فكل من تكلم عن الواقدي بعده لم يذكر موقفه على الإطلاق، ولو ذكره أحد لنسبه إليه دون أن يعلق عليه بشيء الذي يشعر بأن هذا كان موقفا شخصيا لابن النديم في الواقدي.

وقد بذلت جهدًا كي أعثر على أحد تبنّى بموقف ابن النديم لكن دون جدوى. ويبدو أن المحدثين لم يهتموا بهذا الادعاء على الإطلاق. على عكس ذلك، نرى المستشرقين أنهم أخذوا بهذا الطعن، وحاولوا ترويجه في الأوساط الأكاديمية لقدح شخصية الواقدي. وقد أنكر المستشرقان المؤرخ جوزف هوروتز، ومارسدن جونز هذه التهمة على ابن النديم ودافعا عن الواقدي. وقد تصدى هوروتز لنقاش بعض الوقائع التي قد تؤمي لتشيع الواقدي، وأثبت أن هناك حوادث من قبيلها (مناصرة لشيعة علي ﷺ) عند ابن إسحاق وغيره من المؤرخين.(١) وقد ناقش هذه القضية من المعاصرين مُحَمَّد أحمد توحينبي، ودافع عن الواقدي فيها.(٢)

ولو ننظر إلي مغازي الواقدي فيبدو أن وصف الواقدي بالتشيع غير صحيح، لأنه لم يأت فيه بخبر يشير إلى ميلانه إلى التشيع.(٣)

---

(١) هوروتز،جوزف،المغازي الأولى ومؤلفوها،مترجم بالعربية:حسين نصار،مطبعة مصطفى البابي وأولاده،مصر، الطبعة الأولى:١٩٤٩،ص:١٢٥-١٢٦،وهناك ملاحظات للسلومي علي بعض محتويات كلام هوروتز هذ؛ انظر:السلومي، الدكتور عبد العزيز بن سليمان،الواقدي وكتابه المغازي منهجه ومصادره،رسالة الدكتوراة،الجامعة الإسلامية، المدينة المنورة،الطبعة الأولى:٢٠٠٤،١/ ١٣٦-١٣٧

(٢) توحينبي،الدكتور مُحَمَّد أحمد،المؤرخون والتاريخ عند العرب،دارالكتب العلمية،بيروت،بدون ذكر سنة الطباعة، ص:٥٧؛الواقدي،مُحَمَّد بن عمر بن واقد، كتاب المغازي،مقدمة للمحقق الدكتور مارسدن جونس،ص: ١٨،دار الأعلمي،بيروت،الطبعة الثالثة:١٩٨٩، وقال أيضا: لعل وجود كتابين للواقدي، أحدهما فى مولد الحسن والحسين ومقتل الحسين، والآخر فى مقتل الحسين خاصة، يوهم أنه كان شيعيا، كما ذكر ابن النديم، منفردا بهذا الرأى دون غيره. الواقدي، المغازي ،مقدمة،ص:١٦

(٣) بل ساق الواقدي خبرين في سياق الكلام عن غزوة أحد الذي لايمكن أن يسوقهما متشيع صاحب التقية، وهما: (الأول): رواية الواقدي عن غزوة بدر الذي قال فيها ﷺ لعلي بن أبي طالب: "إن كنت أحسنت القتال فقد أحسن عاصم بن ثابت، والحارث بن الصمة، وسهل بن حنيف، وسيف أبي دجانة غير مذموم". (الواقدي، المغازي،١/ ٢٤٩)، وهذا مأأفاده مارسدن جونز،(الواقدي، المغازي ،مقدمة،ص:١٧)، (والثاني): رواية الواقدي عن غزوة أحد الذي فيها: " ثم حمله (أي اللواء) صؤاب غلامهم، فاختلف في قتله: فقائل قال: سعد بن أبي وقاص، وقائل: علي عليه السلام وقائل: قزمان. وكان أثبتهم عندنا قزمان". (الواقدي، المغازي،١/ ٢٢٨) وهذا ما قاله ابن هشام: (الحميري،عبد الملك بن هشام بن أيوب،جمال الدين،السيرة النبوية،تحقيق:مصطفى السقا وإبراهيم الأبياري وعبد الحفيظ الشلبي،شركة مكتبة ومطبعة مصطفى البابي الحلبي وأولاده،مصر،الطبعة الثانية: ١٩٥٥،٢/ ١٢٧)

أما بالنسبة للأخبار المتعلقة بالعهد النبوي ﷺ، فلايوجد فيها ولو مايشير إلى ذلك. لأن الشيعة لا تهمها من وقائع السيرة وأحداثها سوى اثنين فقط، وهما: عقد الأخوة بين الرسول ﷺ وعلي بن أبي طالب عندما جاء إلى المدينة. والثاني هو الخطاب المنسوب إلى الرسول ﷺ الذي يقال إنه خاطب به الصحابة ﷺ بغدير خم حين رجوعه من حجة الوداع. ففيما يتعلق بقضية المؤاخاة، أفادنا الواقدي فيها بثلاثة أخبار: الأولى تشير إلى عقد الأخوة بين الرسول ﷺ وعلي ﷺ.[١] والثانية تشير إلى مؤاخاة الرسول ﷺ بعثمان ﷺ.[٢] والثالثة تشير إلى مؤاخاة سهل بن حنيف بعلي بن أبي طالب رضي الله عنهما. وأما بالنسبة لقضية غدير خم، فلم يرو الواقدي فيها شيئا على الإطلاق.[٣]

وأما بالنسبة لما بعد العهد النبوي ﷺ من وقائع عهد الصحابة والتابعين، فلا نجد عند الواقدي ما يدل على ذلك إشارةً أو صراحةً. أما ما جاء عنده من بعض الأخبار التي تؤلم بالنقد الحاد على سياسة عثمان بن عفان ﷺ في عهده فلا نصيب له فيها، لأنه رواها عن أساتذته وعن شيوخ أساتذته.[٤] ولابد للمؤرخ أن يكون عادلا نزيها في رواية كل ما يصله من الأخبار، وقد فعل الواقدي في هذا الصدد ما كان لائقا بشأنه. وقد ناقش هذه القضية الدكتور يوسف العش في كتابه الشهير ب" الدولة الأموية "، وأثبت أن هناك مايمكن أن يُنقد على الواقدي في هذا الصدد لجرأته في النقل، لكن له مبرر بحيث أنه ساقها بأخبار يرويها عن شيوخه وشيوخ شيوخه.[٥] لكن هناك من أصرّ على أن نقل الواقدي لمثل هذه الأخبار يتلمس منها نوع من التشيع.[٦]

---

(١) وقد روي ابن هشام أيضا خبر المؤاخاة بين النبي ﷺ وبين علي بن ﷺ بدون إسناد عن ابن إسحاق،انظر:ابن هشام،السيرة ،١/ ٥٠٤

(٢) ابن سعد،الطبقات الكبرى،٣/ ٢٢،٦٨

(٣) نور ولي،الدكتور عبد العزيز،أثر التشيع على الروايات التاريخية (في القرن الأول الهجري)،دار الخضيري،المدينة النبوية،الطبعة الأولى:١٩٩٦،ص: ٢٩٣،٢٩٩

(٤) البلاذري،أحمد بن يحيى،أنساب الأشراف،تحقيق:سهيل زكار ورياض الزركلي،دار الفكر،بيروت،الطبعة الأولى:١٩٩٦، ٥/ ٥١٣-٥١٤و٥٤٦-٥٤٧؛والطبري،مُحَمَّد بن جرير،تاريخ الرسل والملوك،دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولى:١٤٠٧هـ،٢/ ٦٥٦،٦٦٥،٦٧٧،و٦٤٤

(٥) العش،الدكتور يوسف،الدولة الأموية (والأحداث التي سبقتها ومهدت لها بدءاً من فتنة عثمان)،دار الفكر،دمشق، الطبعة الثانية:١٩٨٥،ص: ٣٥

(٦) نور ولي،أثر التشيع على الروايات التاريخية (في القرن الأول الهجري)،ص:١٨٨

فلو نستقرئ هذه المرويات لنجد أن الواقدي لم ينفرد بروايتها، بل هناك كثير من أهل السنة من رواها أمثال ابن إسحاق، عبدالرزاق الصنعاني، ابن سعد[١] والمؤرخ الطبري، فهل يحكم على كل واحد منهم أنهم كانوا من المتشعين![٢]

ولو ننظر من ناحية أخرى لنرى أن الواقدي رحمه الله قد روى كثيرا من الأخبار التي تشير إلى محاسن عهد عثمان أيضا، إذن فماذا نفعل به![٣] ولا شك أن المؤرخ قد يميل إلي فكرة ما، لكن هذا لا يكفي للنقد عليه ونسبته إليها وخاصة تهمة التشيع، التي تفضي إلى أن المؤرخ كان ممن يرى اختلاق الأخبار لصالح من يميل إليه.[٤] والواقدي لم ينحصر في هذا الصدد في نقل أخبار جانب دون جانب من عهد عثمان ﷺ، بل حاول عرض كلا الجانبين وفقا للأخبار التي تلقاها.[٥] وقد أقرّ الدكتور عدنان ملحم بأن مراجعة مرويات الواقدي عن الفتنة تشير إلى ميلانه إلى التشيع، لكنها متسمة بالبعد عن التعصب. وقد دعم الواقدي موقف عليّ ﷺ في مقابلته لكل من معسكر عائشة والزبير ومعاوية ﷺ أجمعين. نعم، إنه نقد سياسة عثمان ﷺ نقدًا عنيفًا وأبرز الثغرات فيها.[٦]

فظهر من الأدلة المذكورة بأن موقف ابن النديم ضعيف ولا يصلح الأخذ به. ولابد لمن يريد إثبات موقف ابن النديم في الواقدي عرض نصوص الواقدي نفسه أو مروياته التي تشهد على موقفه، وإلا يكون النقد غير محايد. والله أعلم

---

(١) ابن سعد،الطبقات الكبرى،٣/ ٦٦-٧١

(٢) القط،مواهب تحسين مصطفى،المؤرخون العرب وحركة الردة حتي القرن الرابع الهجري (دراسة تاريخية منهجية)،رسالة الماجستير،كلية الدراسات العليا،جامعة النجاح الوطنية،فلسطين،٢٠٠٩،ص:١٠-١٢

(٣) ابن سعد، الطبقات الكبرى،٣/ ٥٥-٥٦، والطبري،تاريخ الرسل والملوك،٢/ ٥٩٩،٥٩٥،٦٠٠

(٤) ويقول مُحَمَّد بن عبد الرحمن المغراوي تحت عنوان "موقف الواقدي من المبتدعة": له كتب، عناوينها تدل على محاربته للمبتدعة، وذلك الظن به وبأمثاله، وهي: ١-السنة والجماعة وذم الهوى وترك الخوارج في الفتن.٢-كتاب الردة والدار. ٣-مقتل الحسن. ٤- تاب صفين. ٥- مولد الحسن والحسين ومقتل الحسين. هذا الوقت الذي عاش فيه الواقدي، كان يغلي بالأهواء والبدع من جهمية وقدرية وخوارج وغيرهم، فلعله ألف هذه الكتب في بيان أحوالهم،انظر:المغراوي،مُحَمَّد بن عبد الرحمن،موسوعة مواقف السلف في العقيدة والمنهج والتربية،المكتبة الإسلامية للنشر والتوزيع،القاهرة،الطبعة الأولى،٣/ ٢٥٣

(٥) ابن سعد، الطبقات الكبرى،٣/٦٤ و٧٤، الطبري،تاريخ الرسل والملوك،٢/ ٦٦١

(٦) ملحم،الدكتور عدنان،المؤرخون العرب والفتنة الكبري،دار الطليعة،بيروت،الطبعة الثانية:٢٠٠١،ص:٣٤، ولكن الدكتور أثبت في نفس الكتاب (فيما بعد) بأن موقف الصحابة ﷺ أجمعين اختلف في هذا الصدد. راجع نفس الكتاب،ص:١٢٢؛وانظر أيضا:نور ولي،أثر التشيع على الروايات التاريخية (في القرن الأول الهجري)،ص:٣٦٠-٣٦١

المحور الثاني:الواقدي رحمه الله سرق المادة العلمية ممن سبقه

هذه التهمة تعني أن الواقدي أخذ المادة التاريخية لابن إسحاق وذكرها في كتابه المغازي دون أن ينسبها إليه. وقد عُلم أن ابن إسحاق كان قد سبق الواقدي، وكان من أشهر رواة المدينة وتلامذة الإمام الزهري لمرويات السيرة النبوية. وكتابه كان متناولا في أيادي العلماء وفي الحلقات العلمية. والمستشرق جوليوس ولهاؤزن كان أوّل من عرف بهذا الرأي في الواقدي، وقد ادعى في حدثين من حوادث السيرة (رؤيا عاتكة بنت عبد المطلب، وسرية نخلة) بأن الواقدي سرق مادتهما من سيرة ابن إسحاق دون أن يعزوها إليه.(١) واختار رأيه بعده جوزف هوروويتز. وقد قال في هذا السياق: إن الواقدي قد أبدى إعجابا غير عادي لابن إسحاق كما ذكر الطبري في ترجمته، لكن لا يدرى لماذا أن الواقدي لم يذكره في مصادره على الإطلاق! فهذه المشكلة تقتضي منا مزيد العناية والإهتمام.(٢) وربما يمكن أن يكون الواقدي قد أخذ كمّا هائلا من المادة التاريخية لابن إسحاق دون أن ينسبها إليه، وبالتالي أن يكون هذا هو السبب لعدم ذكره له حتى لا يكثر ذكره في كتابه المغازي. وقد قال في نهاية الفهرسة للرواة الذين كانوا من مصادره ما نصه: "وقد حدّث لي الآخرون أيضًا".(٣)

وقد قال مثل هذا الكلام المستشرق مارسدن جونز في مقاله الذي دافع فيه عن الواقدي وأقر بأن ابن إسحاق كان خير نموذجٍ للواقدي في هذا الصدد، وقد وُجد كثير من اقتباسات الواقدي التي تشبه كثيرا لصياغة ابن إسحاق في سيرته، فلا يستبعد أن يكون الواقدي جعله معيارا للسلوك على منواله.(٤)

إن الأخبار التاريخية آنذاك كانت تروى وتنقل من طرق متعددة، فكل أخذها عن طريقه ووضعها في قالب وأسلوب خاص له، وبذلك تفرد بعضهم ببعض فيها، فلم يُتهم فيها أحد بأنه أخذها عن الآخر، بل

---

(1) Fiazer,S,Rizwi, Muhammad and the Medinan Jews: A Comparison of the Texts of IbnIshaq's Kitab Sirat Rasul Allah with al-Waqidi's Kitab al Maghazi, Cambridge, international journal of middle east studies, 1996AD, Isssue: 4, 464

(٢) الطبري،تاريخ الرسل والملوك،١١/ ٦٥٤

(٣) هوروويتز،جوزف،المغازي الأولى ومؤلفوها،ص:١٢١

(4) Jones, J.M.B, Ibn e ishaq and Al-waqidi, The dream of atikah and the raid to nakhla in relation to the charge of plagiarism, Cambridge, Bulletin of the School of Oriental and African Studies, 1959AD, issue: 2, 41

وقال مثل هذا الكلام في تقدمته لكتاب المغازي للواقدي ما نصه: "وبسبب التشابه الكبير بين فقرات كتاب السيرة لابن إسحاق وكتاب المغازي للواقدي، زعم هوروفتس وولهاؤزن أن الواقدي قد سطا على ابن إسحاق دون عزو إليه، بل إن هوروفتس قد ذهب فى زعمه إلى أبعد من هذا، فهو يرى أن لفظة "قالوا" فى مغازي الواقدي بدلا من الإسناد تدل على ذلك السطو"،الواقدي،المغازي،مقدمة،ص:٢٩

تفرد كل منهم بأسانيده رغم المشاركة في المتن. وهذا كان مثل الأخبار التشريعية. فلا يقال: إن الإمام مسلم سرق أخبار البخاري وساقها باسناده دون ذكر اسم الأخير. فشتان ما بين الإستفادة والإنتحال![١]

وفي الواقع، لم يُتهم الواقدي بالسرقة من قِبَل أحدٍ من المستشرقين الذين عملوا على كتابه المغازي من اسبرنجر، وفون كرمر، ومارسدن جونز، وكلهم كانوا عمالقة في علم التاريخ وقضاياه حيث قضوا حياتهم في دراسة التاريخ الإسلامي. وقد كان مارسدن جونز هو الذي حقق كتاب المغازي للواقدي وجاء به لأول مرة في حيز الطباعة. وقد تصدي لدحض هذه التهمة وكتب بحثًا علميًا خاصًا في هذا الصدد.[٢]

إن الواقدي قد ظهر في كتابه المغازي كمؤرخ نحرير اختار آرائه وفقاً للأدلة التي كانت مدعومة بالقرائن الداخلية والخارجية، فيستبعد أن كان سرقها من ابن إسحاق أو غيره من مؤرخي السيرة وانتحلها لنفسه.[٣]

وقد قال مارسدن جونز في المقال الذي دافع فيه عن الواقدي ما نصه:"يبدو أن لدى الواقدي نسخة تحتوي على المزيد من السمات المميزة لأسلوب القصاص عن تلك التي اشتهر بها

(١) يقول الأستاذ مصطفي شاكر: وقد بلغ بمراقبته رأي الناس في علمه أنه كان يأخذ عن ابن إسحاق كثيرا، وقد يمتدحه، ولكن لايصرح باسمه أبدا فيما يأخذ عنه لموضع ابن إسحاق من الريبة في المدينة،(مصطفي، الأستاذ شاكر،التاريخ العربي والمؤرخون (دراسة في تطور علم التاريخ ومعرفة رجاله في الإسلام)،دار العلم للملايين، بيروت،الطبعة الثالثة:١٩٨٣،١/١٦٥)، والظاهر أن الأستاذ قاله تابعا لموقف المستشرق هورووتز، لأنه ليس هناك أحد من قاله من علماء المسلمين. وعلي افتراض صحة هذا القول يحمل علي أن الواقدي استفاد من سيرة ابن إسحاق، وابن إسحاق رغم جلالته وإمامته في هذا الفن لم يكن من مصادر الواقدي. لأني لم أجد خبرا يرويه الواقدي عن طريق ابن إسحاق إلا خبرًا واحداً وهو في تارخ بغداد،(الخطيب البغدادي،أحمد بن علي، تاريخ بغداد،المسمي بتاريخ مدينة السلام وأخبار محدثيها وذكر قطانها العلماء من غير أهلها ووارديها،دراسة وتحقيق:مصطفى عبد القادر عطا،دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولى:١٤١٧هـ،٣/٢٢٨)

(٢) بعنوان: … The dream of atikah،"Ibn e ishaq and al-waqidi

وقد مر بنا ذكره آنفا. وفي هذا المقال دافع مارسدن جونز عن الواقدي، وتصدى للإجابة عن الإشكالات التي أثارها المستشرق ولهاؤزن، وأثبت بأن الواقدي لم يأخذ مادته من سيرة ابن إسحاق انتحالا، بل استفاد كل منهما من الأخبار المتناولة بين يدي المحدثين والمؤرخين آنذاك. وكان لكل أحد أن يأخذها عن طريقه ويستفيد منها كما يشاء. ولذا نري أن هناك عددا من الأخبار التي تفرد بها الواقدي ولم ينقلها ابن إسحاق، وكذلك بالعكس، ثم تعرض مارسدن جونز لبيان الفروق الأساسية عند كليهما في أخبار هذين الحدثين من التاريخ، وقرر بأن مصادر كليهما تختلف عن مصادر آخر. (قارن ما ورد عند الواقدي في مغازيه بما ورد عند ابن هشام في سيرته: من حمل اللواء في غزوة العشيرة،(الواقدي،المغازي،١/ ٩)

(3) Jones, Ibn e Ishaq and Al-Aaqidi,46

ابن إسحاق، ويمكن أن نستنتج من ذلك: أن رواية الواقدي تمثل طراز قصة زمنه المحفوظ لدى الحفاظ بأمانة إلى حد ما..."[١]

وقال أيضا:"رأيي أن الواقدي حينما يستخدم (قالوا) أو "إسنادا جماعيا" فإنه لا يستخدمه بشكل عشوائي في محاولة ساذجة لإخفاء المادة المسروقة، ولكنه يشير إلى آراء أغلبية مصادره الأصلية."[٢]

وقال في نهاية المقال:"لقد حاولت حتى الآن أن أشير إلى أن التشابه بين تفسير ابن إسحاق لرؤيا عاتكة وتفسير الواقدي قد لا يرجع إلى الانتحال (السرقة)، ولكن إلى الوجه أنهما كانا يعتمدان على خزان مشترك من المادة التاريخية."[٣]

إن هذه الأدلة كافية لثبوت أن الواقدي كانت له مصادر تلقى منها مادته التاريخية دون سرقتها من ابن إسحاق، ولو كان الأمر كما قيل، لطعن به الناقدون الذين سبقوا في الطعن على الواقدي من المتقدمين. على عكس ذلك، نرى ابن هشام أخذ بكثير من ترجيحات الواقدي، ورجحها على آراء شيخه ابن إسحاق حينما بدأ يهذب كتابه "السيرة النبوية".[٤]

فيظهر من هذا السرد أن الواقدي كانت له مصادر خاصة اعتمد عليها في نقل مادته التاريخية، وهذا تسبّب لاختلافه مع ابن إسحاق في معظم مرويات المغازي من تحديد المواعيد والمواقيت. ولاشك أن الواقدي كان يتفوق على سلفه في الاستعمال للجمع الإسنادي، والحذر في نقل الخبر الإسرائيلي والدقة في تحديد مواقيت الغزوات ومواعيدها. وهذه بعض ميزات الواقدي التي تفوق بها على أقرانه.[٥]

المحور الثالث:علاقة الواقدي ببني العباس أثرت على الأخبار المتعلقة بهم

ومن المسائل التي طُعن فيها الواقدي هو عدم بقائه محايدا في الأخبار المتعلقة ببني العباس، وأن علاقته ببعض خلفاء بني العباس أنتجت بالتاثير على أخباره، وخاصة التي لاتذهب لصالحهم.

---

(1) Jones, Ibn e Ishaq and Al-Aaqidi,46

(٢) المصدر السابق،ص:٥٠

(٣) المصدر السابق،ص: ٤٧

(4) J.M.B, Jones, The Chronology of the Maghazi, A Textual Survey, Cambridge, Bulletin of the School of Oriental and African Studies, 1957AD, issue:02,270-271

(٥) هوروتز،جوزف،المغازي الأولى ومؤلفوها،ص:١٢١-١٢٣، والواقدي، المغازي،مقدمة،ص:٣١-٣٢

وقد أبدى بهذا الرأي أولا المستشرق جوزف هوروتز،[١] ثم تبناه المستشرق وليم ميور في كتابه "حياة مُحَمَّد".[٢]

وقد علّل جوزف هوروتز لكلامه بأن الواقدي حذف اسم العباس بن عبد المطلب من فهرسة خصوم الرسول ﷺ الذين أُسروا في معركة بدر. واتهمه أيضا بأنه أبهم اسم العباس في قائمة المساعدين الكبار لجيش قريش بالمؤن حيث ذكر مكانه كلمة "فلان". والواقدي أيضا ذكر بأن عمر ﷺ وضع اسم العباس في بداية القائمة التي وضعت للعطاء. ولم يكن ذلك كله إلا لإرضاء الأسرة الحاكمة في عهده. وبالنسبة للمستشرق وليم ميور، فإنه قلد في ذلك جوزف هوروتز ولم يأت بدليل جديد فيه.

وفي الواقع، أنه ثبت بأدلة قوية أن الواقدي قد ألف مغازيه قبل سفره إلى بغداد عاصمة العباسيين آنذاك،[٣] وهذا يعني أنه ألفه قبل تسوية العلاقة معهم، فبالتالي لم يمكنه حذف الأخبار التي لا تذهب لصالحهم، بل الواقدي حاول ذكر كل ما حصل له من أخبارهم سواءً في صالحهم أو ضدهم. فهذه التهمة وضعت دون أساس.

وبالنسبة لرواية أسارى بدر الذي زعم فيه جوزف هورويتز أن الواقدي تعمد فيه حذف اسم العباس، فالأمر فيه ليس كذلك، بل الواقدي روى في هذا الصدد خبرا صريحا الذي فيه اسم العباس في أسارى بدر التي أتي بها إلى المدينة.[٤] نعم، إنه حذف اسم العباس في الخبر الذي رواه مختصرا. ولم يخذف

---

(١) هوروتز،جوزف،المغازي الأولى ومؤلفوها،ص:١٢٥-١٢٦

(٢) حيث قال في هذا الصدد: "إن الواقدي قد درس وألف تحت عناية العباسيين. وكان يتمتع برعايتهم. وقد عاش جزءا من حياته معهم حيث نجد أنه في أيامه اللاحقة عُين قاضيا في بغداد. ويجب أن نضع في خاطرنا دائما أن تأثير العباسيين يُحمل بشدة وباستمرار على قضاياه. وكانت أبحاثه التقليدية واسعةً وأعمالُه (العلمية) ضخما". انظر:Muir, William, The Life of Muhammad , Edinburgh: Jhon Grant,1923AD, ixxx

(٣) هوروتز،جوزف،المغازي الأولى ومؤلفوها،ص:١٢٠

(٤) وهذه هي:قال ابن سعد: "أخبرنا مُحَمَّد بن عمر... عن محمود بن لبيد قال حدثنا عبيد بن أوس مقرن من بني ظفر قال لما كان يوم بدر أسرت العباس بن عبد المطلب، وعقيل بن أبي طالب، وحليفا للعباس فهريا فقرنت العباس وعقيلا فلما نظر إليهما رسول الله ﷺ سماني مقرنا، وقال: أعانك عليهما ملك كريم... أخبرنا مُحَمَّد بن عمر... عن محمود بن لبيد قال :كان العباس بن عبد المطلب حين قدم به في الأسارى طلب له قميص فما وجدوا له قميصا بيشرب يقدر عليه إلا قميص عبد الله بن أبي ألبسه إياه فكان عليه... أخبرنا مُحَمَّد بن عمر... عن جابر بن عبد الله قال: لما أسر العباس لم يوجد له قميص يقدر عليه إلا قميص ابن أبي"،(ابن سعد،الطبقات الكبرى،٤/ ١٢-١٣)

فيه اسم العباس فقط، بل هناك ثمانيةٌ وثلاثون رجلا الذي حذفت أسمائهم من قائمة أسارى بدر فيه.[١] ولا يمكن أن يطعن به الواقدي.

وأما بالنسبة للخبر في ذكر أسماء المطعمين لجيش قريش في طريقه إلى بدر من المشركين، فالأمر كما قال فيه جوزف هورويتز،[٢] لكن هذا وحده غير كافٍ لإثبات هذه التهمة.

وبالنسبة للخبر الذي جاء فيه أن العباس قدِم مع أبي هريرة (رضي الله عنهما) يوم فتح خيبر،[٣] فالواقدي نقده نقدًا شديدًا، وأثبت أن المعروف عند أهل العلم أن العباس ﷺ كان بمكة حينما فتح رسول الله ﷺ خيبر.[٤] فالطعن فيه على الواقدي ليس بصحيح.

وبالنسبة للخبر الذي جاء فيه أن اسم العباس ﷺ كان في بداية الفهرسة الذي دوّنها عمر ﷺ للعطاء،[٥] فالواقدي أنصف فيه حيث ذكر الخبر كما تلقاه، وقد روى الطبري خبرا في تاريخه في نفس معنى خبر الواقدي عن غير طريقه.[٦] فالواقدي لم ينقل خبرا مخترعا، بل نقل ما كان معروفا عند المؤرخين.

الخاتمة

فبالنظر إلى هذه الطعون وأدلتها يظهر لنا أنها بنيت دون دليل، بل على شكوك وافتراضات كما هو دأب كثير من المستشرقين. والواقدي أُستهدف بها من قبل المستشرقين خاصة دون غيره من مؤرخي السيرة؛ لأنه أوضح خبرا، وأبين سياقا في ذكر غزوات النبي ﷺ، وتعامله مع الأقليات غير مسلمة بالمدينة. فمعظم المستشرقين حاولوا في دراساتهم عن سيرة النبي ﷺ أنه كان ﷺ يضطهد الأقليات غير الإسلامية وخاصة اليهود منها، فالواقدي يقف سدًا منيعًا إزاء هذه التهم. وأخباره صريحة في هذه القضايا.[٧] فهو يحتل مكانة مرموقة في تاريخ غزوات النبي صلى الله عليه وسلم حيث سدّ ثغرات وفجوات منها لم يسدّها إلا هو.والله أعلم

❁ ❁ ❁

(١) السلومي،الواقدي وكتابه المغازي،١٤٩/١

(٢) حيث قال فيه: ثم نحر لهم فلان عشرا،(الواقدي، المغازي،١/ ١٤٥)، وقد صرّح به ابن هشام ونصه: "وكان المطعمون من قريش، ثم من بني هاشم بن عبد مناف:العباس بن عبد المطلب بن هاشم..."،(ابن هشام،السيرة،١/ ٦٦٤)

(٣) فهذا الخبر في بادئ النظر يذهب لصالح العباس ﷺ حيث فيه إنه ﷺ قد هاجر من مكة إلي المدينة عند فتح خيبر.

(٤) ابن سعد،الطبقات الكبرى،٤/ ١٧

(٥) المصدرالسابق،٤/ ٣١-٣٢

(٦) الطبري،تاريخ الرسل والملوك،٣/ ٦١٤

(٧) الأخبار المتعلقة بنقض اليهود لعهد النبي ﷺ الذي تسبب لقتالهم وإجلائهم من المدينة،(الواقدي،المغازي، ٤٥١/٢-٤٦٠،٤٦٢،٤٧٤،٤٩٢،٥٠١، ٥٠٣،٥١٠)

"لا ضرر ولا ضرار"قاعدة ذهبية لحماية البيئة

Do not be Harmed or Harm Others, A Golden Principle for Social Peace

د. عبدالحى المدنى *

د. عمير رئيس الدين**

ABSTRACT

Islam is a divine religion and a complete system for life which has always shown the right way to humanity. The legal system of Islam has solved major problems of humanity. Islam is a universal moderate religion that could be applied in every age and nation. Today the world needs a legal system where it is possible to have security and peace. This can largely be achieved under the legal system of Islam. In Islamic legal system, psychological and natural traits of entire humanity is considered. For that reason, in Islamic legal system, some important juridical issues were given due consideration. For example, no law should be enacted which is unbearable by the masses; Individual and collective liberty were given due recognition in Islamic legal code. Likewise, there is a well-known principle from a *Ḥadīth*: "Do not be harmed or harm others in Islam". This article is divided into following:

First: Citation of the different expressions of this maxim and its importance,

Second: Literal and Religious definition of the principle with the difference between "being harmed" and "harming"

Third: A detailed explanation of the principle with examples

Fourth: Proofs for the principle and the reasons for choosing them

Fifth: Principles that strengthen or explain this principle: explanation and link with the principle "Do not be harmed or harm others"

Keywords*: Islam, Legal System, Do not be Harmed or Harm Others.*

* أستاذ مشارك، جامعة أين اي دي للهندسة والتكنالوجية، كراتشي، باكستان

** محاضر جامعة سنده مدرسة الإسلام كراتشي، باكستان

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على رسول اللهﷺ، وبعد:

ما من فن من الفنون المتعلقة بالشريعة إلا وقد بحثها العلماء، وكتبوا فيها مؤلفات ما بين مجلدات ورسائل.

وإن القواعد الفقهية علم من العلوم المتعلقة بالشريعة الإسلامية، وقد اهتم الفقهاء بها لما فيها من السهولة والإحاطة بأحكام الفروع دون حفظها، والإلمام بمدلولاتها دون جمعها، ولما يترتب عليها من إنتظام الكليات للجزئيات فتتضح القواعد الفقهية في الأحكام الفروعية.

فضبط الأمور المنشرة في القوانين المتحدة أوعى لحفظها وأوعى وفهمها، فقام العلماء بجمعها وضبطها، وكتبوا فيها مؤلفات صغيرة وكبيرة ومنها قاعدة فقهية"لاضرر ولاضرار"أصلها من حديث نبوي شريف يبني عليها كثير من أبواب الفقه، بل هي كلية تنضبط تحتها جزئيات فقهية كثيرة.

وقد قمنا بكتابة مقالة قصيرة حولها، وتنقسم إلى المباحث التالية:

المبحث الأول: وفيه ذكر صيغ القاعدة الموجودة في كتب العلماء، ثم تكلمنا عن أهميتها وأنّها تشتمل على جزئيات فقهية كثيرة.

المبحث الثاني: تكلمنا فيه عن مفردات القاعدة، والفرق بين الضرر والضرار

المبحث الثالث: ذكرنا فيه معنى القاعدة إجمالاً مع ذكر بعض الأمثلة لتوضحيها

المبحث الرابع: فيه ذكر الأدلة على القاعدة مع بيان وجه الإستدلال بها

المبحث الخامس: قواعد أخرى تعتبر تقييداً لها أو ترتيباً عليها تفريعًا عنها وهي:

الأولى: "الضرر يدفع بقدر الإمكان" تكلمنا عن القاعدة مع الأمثلة الفقهية عليها، وعلاقتها بالقاعدة الكبرى

الثانية : الضرر لا يزال بمثله – ذكرنا معنى القاعدة وعلاقاتها بالقاعدة الكبرى

الثالثة: الضرر الأشد يزال بالضرر الأخف –ذكرنا ألفاظ القاعدة، ومعناها، وعلاقتها بالقاعدة الكبرى

الرابعة : يتحمّل الضرر الخاص لدفع ضرر عام- ذكرنا معنى القاعدة وعلاقتها بالقاعدة الكبرى

الخامسة: درء المفاسد أولى من جلب المصالح –ذكرنا معنى القاعدة وعلاقتها بالقاعدة الكبرى

المبحث الأول: صيغ القاعدة "لا ضرر ولا ضرار" وأهميتها

ذكر العلماء هذه القاعدة بعدة صيغ منها:

"لاضرر ولاضرار"[١]

(١) مجلة الأحكام العدلية،مع شرح سليم رستم باز،جماعة من العلماء الدولة العثمانية،دار الكتاب العلمية،بيروت، الطبعة الثانية،٢٩/١

"مأخوذ من الكلمة النبوية "الضرر لا يزال بالضرر"[١]

وقد صاغها البعض بلفظ "يزال الضرر بلا ضرر"[٢]

"الضرر يزال"[٣]

وهذه الصيغة هي الأكثر شيوعاً في كتب القواعد الفقهية، وقد اعتبر بعض العلماء قاعدة "الضرر يزال" ونحوها مندرجة تحت قاعدة "لاضرر ولا ضرار" باعتبار أن الأولى كون القاعدة الكبرى هي اللفظ النبوي، ليعطي ذلك القاعدة قوة في الإستدلال بها، وليكون استنباط الأحكام الشرعية منه مباشرة.

ورأى البعض أن يأخذ بهذا القول "لا ضرر ولا ضرار" وغيره من الأقوال قاعدة كبرى وهي "الضرر يزال" ويكون أحد أدلتها هو هذا الحديث. وعلى كل حال نحن نرى أن اعتماد الصياغة النبوية أولى، لذلك جعلنا هذه القاعدة الكبرى "لاضرر ولاضرار".

أهمية هذه القاعدة

هذه القاعدة من أركان الدين وأساسيات الشرع، ويبني عليها كثير من أبواب الفقه خاصة المعاملات كالرد بالعيب وسائر أنواع الجناية، والحجر بجميع أنواعه، والحدود، والقصاص، والشفعة، والكفارات، وضمان المتلفات وغير ذلك.

وقد نقل العلائي رحمه الله: "إنه ينبني عليها كثير من أبواب الفقه بكمالها مسائل لا تعد كثرة"[٤]

المبحث الثاني: معاني مفردات القاعدة والفرق بين الضرر والضرار

أمّا "لا" فهي لنفي الجنس و"الضرر" خلاف المنع[٥]

يعني إلحاق مفسدة بالغير مطلقاً وهذا لغةً.

أمّا في الاصطلاح : "قد فرّق كثير من العلماء بين الضرر والضرار".

---

(١) الزركشي،مُحَمَّد بن بهادر،المنثور في القواعد،وزارة الأوقاف،الكويت،الطبعة الأولى:١٤٠٢هـ،٣٢١/٢؛ السيوطي، جلال الدين عبد الرحمن بن أبي بكر،الأشباه والنظائر في قواعد فقه الشافعية،دارالكتاب العربي،بيروت،الطبعة الأولى:١٩٨٧م،١٧٦

(٢) الحنبلي،شرح الكوكب المنير،مُحَمَّد بن أحمد الفتوحي،مركز البحث العلمي،جامعة أم القرى،مكة المكرمة،الطبعة الأولى: ١٤٠٨هـ،٤/ ٤٤٢

(٣) ابن نُجيم الحنفي،العلامة زين الدين بن إبراهيم،الأشباه والنظائر،دار الفكر،بيروت،الطبعة الثانية:١٤٩٩م، ص:٩٤؛ الزرقاء،أحمد بن مُحَمَّد،شرح القواعد الفقهية،دار الغرب الإسلامي،بيروت،الطبعة الأولى،ص:١٢٥

(٤) النووي،أبو زكريا يحيي بن شرف،المجموع شرح المذاهب،المكتبة العالمية،القجالة،٣٧١/١،٣٧٢

(٥) ابن فارس،أبو الحسين أحمد،معجم المقاييس في اللغة،مطبعة مصطفي البابي الحلبي،مصر،الطبعة الثانية:١٣٨٩هـ، ٣٦٠/٣

فقد قيل :"إن "الضرر" هو الإسم و"الضرار" هو الفعل فيكون معنى نفي الضرر والضرار في القاعدة أن الضرر نسفه منتفي به الشريعة، وإلحاق الضرر بالغير دون الحق كذلك محرم".

وقيل:"إن الضرر ما يكون إبتداء يعني أن يضر الآخر الذي لم يضره"،"والضرار يكون على سبيل المقابلة يعني يضر بمن قد أضرّ به أولا، ويقيد هذا بأن يكون على وجه غير جائز".

وقيل غير ذلك، وقال بعض العلماء: "إنّهما بمعنى واحد فيكون الثاني مؤكداً للأول".[١]

معنى القاعدة إجمالاً:

هذه القاعدة ظاهرها نفي لما ليس بمنتف حقيقة، ولما كان هذا مخالفاً للواقع عُلم أن ظاهر النفي غير مراد، وأنه لا بد من صرفه عن ظاهره إلى معنى آخر.

والمعاني التي سبق ذكرها لا تخرج – في مجموعها – عن الدلالة على حقيقة الضرر من حيث هو أو على ما يقع من بعض الناس على بعض من أذي، أو ضرر، فعلى كون المراد بالضرر أو الضرار حقيقة بصرف النظر عن وقوعه أو عدم وقوعه يكون معنى القاعدة نفي وجود الضرر في الشريعة وما توهم العقل أنه ضرر فهو في حقيقته مصلحة[٢]

وعلى كون المراد بالضرر أو الضرار ما يقع عن بعض الناس على بعض يكون معنى القاعدة، النهي عن إيقاع الضرر في الشرع؛ لأنّه نوع من الظلم، وإيقاع الضرر وإلحاقه دون الحق على نوعين.

١. أن لا يكون له هدف إلا الضرر بذلك الغير، يعني لا تكون فائدة تعود عليه، فلا ريب في تحريمه وقبحه كنهي الشارع عن المضارة في الوصية كما في قوله تعالى:﴿. . . مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصَىٰ بِهَا أَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَارٍّ وَصِيَّةً مِّنَ اللَّهِ. . .﴾[٣]

والرجعة في النكاح دون نية الزوجية قوله تعالى:﴿ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ﴾[٤]

٢. وكذلك أن يكون له مقصد آخر صحيح، مثل التصرف في ملكاته بما فيه مصالح له فتجاوز ذلك إلى ضرر الآخرين، فهذا ينظر فيه إن كان على خلاف العادة كمن أوقد ناراً في بيته أو

---

(١) ابن رجب،عبد الرحمن بن أحمد،جامع العلوم والحكم في شرح خمسين حديثاً من جوامع الكلم،مؤسسة الكتب الثقافية،بيروت،ص:٢٦٧

(٢) البورنو،محمّد صدقي،الوجيز في إيضاح قواعد الفقه الكلية،مكتبة المعارف،الرياض،الطبعة الثانية:١٤١٠هـ،ص:١٩٣؛الزرقاء، مصطفي بن أحمد،المدخل الفقهي العام،دارالفكر،بيروت،٩٧٨/٢

(٣) سورة النساء،الآية: ١٢

(٤) سورة البقرة،الآية:٢٣١

أرضه في يوم عاصف فتجاوزت إلى جاره، وأحرقت ماله فالفاعل يعتبر متجاوز بفعله في ذلك، وعليه الضمان، أما إن كان على وجه معتاد ففي نهيه قولان: الأول: لا ينهى من ذلك؛ لأنه تصرف في خالص حقه، وعلى الوجه المعتاد، وذهب إلى ذلك الإمام الشافعي وأبو حنيفة والثاني: يمنع من فعله ذلك وعليه الضمان، وذهب إلى ذلك الإمام أحمد ومالك [١] وهذا هو الراجح إذا كانت مصلحة الفاعل دون ذلك الضرر، وذلك نظرا لقاعدة "سد المفسدة أولى من جلب المصلحة". إذا تعارض المفسدة والمصلحة فقدم دفع المفاسد.

وينبغي أن يقيد كل هذا ببعض القيود منها:

أن الضرر لا يكون فيه مما أذن الشرع بوجه حق، فإن هذا النوع من الضرر لا يدخل تحت القاعدة ولا تجب إزالته الذي يعاقب الجاني، ولا الضرر الذي يلحق الضامن بضمانه ما اتلف وما أشبه ذلك في الحدود والعقوبات؛ لأن هذا مما ثبت بوجه حق واذن فيه الشارع كما قال تعالى: ﴿ وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُم بِهِ وَلَئِن صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِينَ ﴾[٢]

وقوله تعالى:﴿فَمَنِ اعْتَدَى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ﴾[٣]

وربما صح أن لا يسمي ضرراكضوء الآية: ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَاأُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾[٤]

المبحث الثالث :أدلة القاعدة

استدل العلماء على صحة هذه القاعدة ما يلي:

بحديث النبيﷺ: "لاضرر ولاضرار"[٥] وصححه الألباني رحمه الله [٦]، ونص هذا الحديث في هذه القاعدة، بل هو لفظها عند بعضهم، ويستدل لها بالنصوص التي فيها المنع عن إيقاع الضرر بالغير كقوله تعالى :﴿. . . وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ. . .﴾[٧]

وقوله تعالى :﴿. . . لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَهُ بِوَلَدِهِ. . . ﴾[٨]

---

(١) ابن رجب،جامع العلوم والحكم في شرح خمسين حديثاً من جوامع الكلم، عبد الرحمن بن أحمد،ص:٢٥٧و٢٥٨-٢٥٩

(٢) سورة النحل،الآية:١٢٦

(٣) سورة البقرة،الآية:١٩٤

(٤) المصدر السابق:١٧٩

(٥) القزويني،مُحَمَّدبن يزيد ابن ماجه،سنن،كتاب الأحكام،باب من بنى في حقه مايضر بجاره،رقم الحديث: ٢٣٤٠،دارالفكر،بيروت

(٦) الألباني،مُحَمَّد ناصر الدين،سلسلة الأحاديث الصحيحة وشيء من فقهها،دار المعارف،الرياض،١/ ٢٥٠

(٧) سورة البقرة،الآية:٢٨٢

(٨) المصدرالسابق:٢٣٣

وقول النبيﷺ: "من ضار أضر الله به، ومن شاق شاق الله عليه"[١]،وكذا كل ما نهى عنه شرعاً كالتجسس، والنجش، والتباغض، والحسد، والغشة وغير ذلك.

ويستدل لها بالأدلة المتضمنة للأمر بالإحسان والحث عليه كقوله تعالى:﴿وَأَحْسِنُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴾[٢]

وكقوله تعالى :﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَى وَيَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾[٣]

وقول النبيﷺ:"إن الله كتب الإحسان على كل شيء فإذا قتلتم فأحسنوا القتلة، وإذا ذبحتم فأحسنوا الذبحة"[٤]

ووجه الإستدلال من الأدلة الآمرة بالإحسان أن الضرر ضد الإحسان تماماً، والإحسان يقتضي أن لايضر الإنسان إلى الغير.

المبحث الرابع : عمل الفقهاء بالقاعدة

لقد اجتمع الفقهاء على الأخذ بهذه القاعدة، وعلى أنّها مبادئ الشريعة، وتتجلى بتطبيق هذه القاعدة في كل أمر بأن مصلحة مشروعيته إنّما هي رفع الضرر، والمعاملات هي أكبر مجال لتطبيقها، حيث أن الأمر متعلق بطرفين، ولذلك فقد ذكر العلماء أنه قد ينبني على هذه القاعدة أبواب فقهية كثيرة كمشروعية خيار العيب، وسائر أنواع الخيار ،والحجر بأنواعه، وضمان المتلف ومشروعية الشفعة ورفع الضرر عن الشريك، وفسخ النكاح بالعيوب أو الإعتبار، ومشروعية القصاص والدية والحدود ونصب الأئمة، والقضاة وغير ذلك. ونوضح ذلك ببعض الأمثلة:

لو باع الشخص شيئا الذي يسرع إليه الفساد كالخضروات والفواكه ولم يحضر مشتري على الموعد فللبائع أن يفسخ البيع ويبيع من غيره دفعاً للضرر.

ولو إنتهت مدة الإجارة للأرض الزراعية قبل الإستحصاد فالزرع يبقى في يد المستأجر بأجر المثل حتى يستحصد منعاً للضرر الواقع على المستأجر بقلع الزرع قبل آوانه.

---

(١) ابن ماجه،سنن ابن ماجه،كتاب الأحكام،باب من بنى في حقه ما يضر بجاره،رقم الحديث:٢٣٤٢

(٢) سورة البقرة،الآية:١٩٥

(٣) سورة النحل:٩٠

(٤) القشيري،مسلم بن الحجاج بن مسلم،الجامع الصحيح،كتاب الصيد والذبائح وما يؤكل من الحيوان،باب الْأَمْرِ بِإِحْسَانِ الذَّبْحِ وَالْقَتْلِ وَتَحْدِيدِ الشَّفْرَةِ،رقم الحديث :٥١٦٧،دارالأفاق الجديدة،بيروت

المبحث الخامس: قواعد أخرى ملحقة بالقاعدة الكبرى

وقد بيّن الفقهاء بهذه القاعدة من القواعد المتعلقة بها إمّا ترتيبًا عليها، أو تقييدًا لها، أو تفريغاً عنها ومن تلك القواعد ما يلي:

القاعدة الأولى: الضرر يدفع بقدر الإمكان(١)

المعنى الإجمالي للقاعدة:

لما تقرر من خلال القاعدة الكبرى أنه لا ضرر ولا ضرار بمعنى المنع منه، أو نفى وجوده فى الشرع جاءت هذه القاعدة لتقرر أن من إزالة الضرر منع وقوعه فالضرر كما أنه يجب رفعه بعد وقوعه فإنه يلزم دفعه، ومنع حصوله قدر الإمكان والإستطاعة فإن أمكن منعه دون ضرر أصلاً فهو المطلوب وإلا فيتوصل إلي دفعه بإرتكاب أخف الضررين فهي من باب الوقاية خير من العلاج.

ومعنى منع حصول الضرر قبل وقوعه إتخاذ التدابير الواقية من وقوعه ومن أمثلة ذلك:

شرع الحدود والعقوبات فإنّها من جهة رفع الضرر الحاصل الواقع (وهو إذهاب غيظ الأنفس بإيقاع العقوبة علي الجاني)، ومن جهة أخرى هي مانعة من وقوع الجرائم والمعاصي من الشخص نفسه أو من غيره. وشرع الحجر على المفلس منعاً للضرر عن الدائنين.

وأدلة القاعدة

قال سبحانه وتعالى:﴿ وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِنْ دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ﴾(٢)

وجه الدلالة منها أن الله أمر المؤمنين بإعداد القوة لدفع وردع الأعداء إستعداداً لذلك قبل وقوعه

القاعدة الثانية : الضرر لا يزال بمثله

يعني في الدرجة وذلك في حالة التعارض.

هذه القاعدة عبارة عن قيد لقاعدة "الضرر يدفع بقدر الإمكان" التي تقرر أن الضرر يزال بقدر الإمكان، وهذه تفيد أن هذه الإزالة مقيدة بأن لا يترتب عليها حصول ضرر على غيره مساو للضرر المزال أو أعلى وأكبر منه.

ومثال ذلك أنّه لا يجوز لمن أُكره على قتل غيره –بقتله– أن يقتله دفعاً للضرر عن نفسه.

---

(١) مُحَمَّد بن أحمد الفتوحي الحنبلي،شرح الكوكب المنير،٤/٤٤٢،أحمد بن مُحَمَّد الزرقاء،شرح القواعد الفقهية،ص:١١٤

(٢) سورة الأنفال،الآية:٦٠

ولا ترد السلعة المعينة إذا كان قد حدث بها عيب آخر عند المشتري لدفع الضرر عن نفسه، وإلحاقه بالبالغ إلا إذا رضي البالغ مع دفع أرش ذلك العيب.

أدلة القاعدة

يمكن الإستدلال لها بالأدلة التي فيها الأمر بالموازنة بين المصالح والمفاسد كقوله تعالى : ﴿....وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا....﴾ (١)

من جهة دلالتها على أن الضرر لا يزال بالضرر إلا إذا كان الضرر المزال أعلى وأكبر درجة.

القاعدة الثالثة: الضرر الأشد يزال بالضرر الأخف

وذكرت هذه القاعدة بألفاظ مختلفة في كتب أصول الفقه والقواعد الفقهية وهي:

"يختار أهون الشرين أو أخف الضررين" أو

"إذا تعارض مفسدتان روعي أعظمهما ضرراً بارتكاب أخفهما " أو

"إذا إجتمع ضرران أسقط الأصغر الأكبر" أو

"الضرر الأشد يزال بالضرر الأخف"(٢)

المعنى الإجمالي للقاعدة

هذه القاعدة بألفاظها المختلفة يعبّر عن معنى ومقصد واحد، وهي تعتبر مقيدة للقاعدة الكبرى "لا ضرر ولا ضرار"وذلك إذا كان الضرر يمتنع الضرر شرعاً إيقاعه من حيث العموم والجملة.

فإنّ هذه القاعدة تبين أنه قد يضطر الإنسان في حياته إلى مواجهة بعض الضرر، وبإرتكابه ذلك يجتمع له ضرران أو مفسدتان متعارضان لا يمكن إنتفاؤهما معاً إمّا عقلاً أو شرعاً فيجوز له أن يرتكب أخف الضررين لإزالة الضرر الأكبر ودفعه.

ومثاله: لو لم يجد المصلي ما يستر به عورته فإنه يصلي – على أحد قولي العلماء – جالساً يومييئ بالركوع والسجود، وذلك أنه إجتمعت مفسدتان أو ضرران أحدهما إنكشاف العورة في الصلاة والآخر ترك القيام فيها، ولا يمكن درؤهما إلا بإرتكاب أحدهما فمبني هذا القول أنّ ترك القيام أهون من إنكشاف العورة في الصلاة (٣)

---

(١) سورة البقرة:٢١٩

(٢) جلال الدين عبدالرحمن بن أبو بكر السيوطي،الأشباه والنظائر،ص:١٧٨،وابن نجيم الحنفي،الأشباه والنظائر،ص:٩٨

(٣) المقدسي،ابن القدامة،المغني،دار عالم الكتب الكتب،الرياض،الطبعة الرابعة:١٩٩٩م،٣١٢/٢

ومن ذلك مفاداة أسرى المسلمين – عند الكفار– بالمال فدفع المال إليهم لا شك أنها مفسدة؛ لأنهم سيتقوون بذلك عدتهم لكنه أهون من مفسدة ترك المسلمين بأيديهم، فلذلك يلجئي إلى المفاداة لدفع أشد الضررين.

فيتبين منه أن هذه القاعدة إستثناء من عموم القاعدة "لا ضرر ولا ضرار" فيجوز إيقاع الضرر الأخف إذا كان سبباً في زوال الضرر الأكبر.

أدلة القاعدة

قوله تعالى :﴿لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ﴾[١]

وقال في مقام آخر:﴿فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾[٢]

فعموم هاتين الآيتين يدل على أنه إذا كان لا يسع المكلف الإنفكاك والخلاص عن الضررين أو المفسدتين فإنه يختار أهونهما، وهذا الذي يسعه ويستطيعه.

القاعدة الرابعة: يتحمل الضرر الخاص لدفع ضرر عام[٣]

وهذه القاعدة قريبة من الثالثة المذكورة، ويمكن أن يجعل بمثابة البيان لما أجمل في تلك القاعدة. فهي تشترك مع القاعدة الثالثة في إجتماع الضررين وتعارضهما، إن الحكم في ذلك منع المضرة العظمى ودفعها وإن ترتب عليه حصول أدناهما، وهذا من حيث الإجمال.

ومن جهة التفصيل فإن هذه القاعدة (أي الرابعة) بينت، ووضحت طريقاً من طرق الموازنة بين الضررين والمفسدتين. فهذه القاعدة جعلت مقياس الترجيح هنا هو النظر إلى عموم الضرر وخصوصه، فيحتمل الضرر الخاص في سبيل منع الضرر العام، لأن الضرر الخاص أهون وأخف من حيث كون ضرره واقعاً على الأقل من الناس أو على واحد منهم.

ومن أمثلة القاعدة:

جواز رمي الكفار (عند بعض الفقهاء) [٤] الذين تترسوا ببعض المسلمين لدفع ضرر الكفار وإن ترتب عليه ضرر خاص في حق المترس بهم من المسلمين دفعاً للضرر العام عن عموم المسلمين.

والحجر على الطبيب الجاهل أو غير الماهر حرصاً على أرواح الناس وغير ذلك.

---

(١) سورة البقرة،الآية:٢٨٦

(٢) سورة التغابن،الآية:١٦

(٣) ابن نجيم الحنفي،الأشباه والنظائر، ص:٩٦

(٤) المقدسي،ابن القدامة،المغني،دار عالم الكتب الكتب،الرياض،الطبعة الرابعة:١٩٩٩م،١٣/٤٤

ومن أدلة القاعدة:

قول النبيﷺ: "إنما نهيتكم من أجل الدافة التي دفت فكلوا، وادخروا، وتصدقوا"[١]

ووجه الإستدلال:

أن النبي ﷺ نهاهم عن إدخار لحوم الأضاحي فوق ثلاثة أيام مراعاة لمصحلة العموم، ودفع الضرر الذي كان قد عمّ على أغلب الناس من الجوع والفقر مع ما ترتب علي ذلك من ضرر على خصوصي.

القاعدة الخامسة: سدّ المفاسد أولى من جلب المصالح[٢]

فهذه القاعدة كذلك تعتبر مقيدة للقاعدة الكبرى "لا ضرر ولا ضرار"، والفرق بين هذه القاعدة والثالثة. إن الثالثة كانت تتعلق بتعارض ضررين أو المفسدتين لا يمكن درؤهما معاً، وهذه تتعلق بتعارض المصلحة والمفسدة.

ومعنى القاعدة: أنه إذا تعارض تحصيل مصلحة مع دفع مفسدة طارئة لم يمكن الجمع بينهما فإن دفع المفسدة يقدّم على جلب المصلحة إذا كانت المفسدة أعظم وأكبر من المصلحة، أو كانت متساوية للمصلحة عند أكثر العلماء، أمّا إذا كانت المفسدة أصغر من المصلحة ففيه خلاف قوي للعلماء في تقديم أحدهما على الآخرى[٣]

وذلك أن الأصل في كل مصلحة مشروعية تحصيلها، وفي كل مفسدة منعها وإزالتها، فإذا لم يمكن تحقيق ذلك في الجانبين، فإن دفع المفسدة يكون أولى؛ لأنه منع المضرة زائدة بينهما، وعدم جلب المصحلة بقاء على الحال الأصلي، والعمل بهذه القاعدة يدخل في باب إختيار أهون الشرين وأخف الضررين أيضاً.

الأدلة:

إستدل العلماء لهذه القاعدة بقوله تعالى: ﴿ وَلا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾[٤]

---

(١) مسلم،الصحيح بشرح النووي،كتاب الأضاحي،باب ما كان من النهي عن أكل لحوم الأضاحي بعد ثلاث في أول الإسلام وبيان نسخه وإباحته إلى متى شاء،رقم الحديث:١٩٧١م،دار الكتاب العربي،بيروت،لبنان،١٩٨٧م،١٣٥/٥

(٢) جلال الدين عبدالرحمن بن أبو بكر السيوطي،الأشباه والنظائر،ص:١٧٩،ابن نجيم الحنفي،الأشباه والنظائر،ص:٩٩

(٣) الشاطبي،إبراهيم بن موسي اللخمي،الموافقات في أصول الشريعة،المكتبة التجارية،مصر،الطبعة الثانية:١٣٩٥هـ،٢٣/١؛ السلمي،مُحَمَّد بن عبدالعزيز بن عبدالسلام، قواعد الأحكام في مصالح الأنام،دارالجيل،بيروت،الطبعة الثانية:١٤٠٠هـ، ١٠/١-١١

(٤) سورة الأنعام،الآية:١٠٨

ووجه الإستدلال: أن الشارع أهدر المصلحة المتحققة في سبّ آلهة الكفار وهي تحقيرهم، وبيان سفههم، وذلك في مقابل دفع مفسدة أن يسبّوا الله عدواً بغير العلم، وهذه في الحقيقة مفسدة كبيرة.

ومن الأدلة على هذه القاعدة:

من المعروف أن إعتناء الشارع بالمنهيات أشد من إعتنائه بالمأمورات، ولذلك قال النبيﷺ:"إذا نهيتكم عن شيئ فاجتنبوه، وإذا أمرتكم بأمر فأتوا منه ما استطعتم"(١)

فالنبي ﷺ قيّد العمل بالمأمورات بالإستطاعة، وأطلق الإجتناب بالمنهيات، ومن المعلوم أن دفع المفاسد من قبيل المنهيات فكان مقدما على جلب المصالح الذي هو من قبيل المأمورات عند تعارضهما.

ونحن نجد تسامح الشريعة بترك بعض الواجبات بأدنى مشقة مثل القيام في الصلاة، والفطر في رمضان ولم نجد تسامح الشريعة في الإقدام على المنهيات مطلقاً وخصوصاً الكبائر.

وللفائدة نذكر قاعدة أخرى لها علاقة قوية بهذه القاعدة "سدّ المفسدة أولى من جلب المصلحة" وهي قاعدة "إذا إجتمع الحلال والحرام أو المبيح والمحرم غلب الحرام"(٢)

ومعنى القاعدة: إذا تعارض دليلان في شيئ واحد أحدهما يقتضي تحريمه والآخر إباحته سبق دليل التحريم في الأصح تغليباً للتحريم ودرء المفسدة ففي تغليب جانب الحرمة درء المفسدة.

مثاله: يُمنع مالك الدار فتح نافذة تطل على مقر نساء جاره، فهذا وإن كان فيه منفعة له، لكن فيه ضرر ومفسدة للآخر.

ومن أمثلته: إذا كان حيواناً أحد والديه مأكولات اللحم والآخر غير مأكولات اللحم لا يجوز أكله في الأصل كالبغل. وكذا إذا اشتبه حيوان مذكي بميته أو ماء وبول دون وجود علامة التفريق لم يجز تناول شيء منها وذلك تغليباً للحرام على الحلال.

يجب ملاحظة أمرين على القاعدتين الثالثة والرابعة :

أولهما: أن تحقيق كون المفسدتين أو المفسدة والمصلحة (عند التعارض) متساويتان أو متفاوتتان مما تختلف فيه وجهات النظر والتقدير. ويبني على ذلك الإختلاف في كثير من الأمور الإجتهادية.

وبحثنا هذا يتعلق بشرح القاعدة وفهمها لا التعمق في الفروعات الإجتهادية.

---

(١) البخاري،مُحَمَّد بن إسماعيل،صحيح البخاري مع الفتح،كتاب الإعتصام بالكتاب والسنة،باب الإقتداء بسنن رسولﷺ، دار يان للتراث،القاهرة،الطبعة الثانية:١٤٠٩هـ،٢٠/١٣

(٢) جلال الدين عبدالرحمن بن أبو بكر السيوطي،الأشباه والنظائر،ص:٢٠٩،كشف الأسرار عن أصول البزدوي،دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولى:١٩٩٧م،١٧٨/٣

ثانيهما: أنّه يجب النظر إلى المفسدتين أو المفسدة والمصلحة (عند التعارض) مجردتين عن متعلقهما، فإذا تعارض مفسدتان إحداهما تتعلق في الشخص نفسه والأخرى في غيره فإنه لا يدفع مفسدته بإيقاع الضرر على الغير بحجة كون ما يتصل بالغير من الضرر أهون عليه مما يتصل به نفسه. والله أعلم.

الخاتمة

وبذلك فإن لقاعدة "لا ضرر ولا ضرار" دور كبير في منع التجاوزات في النظام الإسلامي سواء عمل مستوى الأفراد أو المجتمع أو الدولة، وهذا بدوره يحل كثير من المشاكل التي تعاني منها الأفراد والمجتمع في عباداتهم وخاصة في معاملاتهم بسبب حرص كل جهة على تحقيق مصلحتها دون الإنتباه لما ينتج عن ذلك من أضرار ومفاسد، وهذا ما يظهر جليا من خلال نتائج هذا العرض الموجز، والتي ألخصها فيما يلي:

١. النظام الإسلامي هو حل وحيد لمشاكل الإنسانية سواء كانت في مجال العبادات والمعاملات والإقتصاديات والسياسيات وغير ذلك.
٢. هذه القاعدة "لا ضرر ولا ضرار" من أركان الدين وأساسيات الشرع، ويبني عليها كثير من أبواب الفقه خاصة المعاملات كالرد بالعيب وسائر أنواع الجناية، والحجر بجميع أنواعه، والحدود، والقصاص، والشفعة، والكفارات، وضمان المتلفات وغير ذلك.
٣. يتكامل دور الأفراد والمجتمع والدولة في تطبيق هذه القاعدة، حيث يلزم بها الأفراد فإذا تساهلوا في الإلتزام بها تتدخل الدولة مستخدمة سلطتها الإقتصادية لمنع كل التجاوزات عن طريق الأجهزة التابعة لها من حسبة وشرطة وغيرها.
٤. لا يكتفي النظام الإسلامي بجلب المصالح، بل يحرص على دفع المفاسد، وفي حالة التعارض يقدم دفع المفاسد على جلب المصالح.
٥. بتطبيق هذه القاعدة تتحق المصلحة الخاصة والعامة، ومن ثم يتطور المجتمع، ويزدهر في جميع الميادين على أساس العدل ومنع الظلم المؤدي إلى الضرر.
٦. نشاطات الأفراد في الحياة غير مقيدة ما دام أصحابها يلتزمون بهذه القاعدة.

❁❁❁